بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفسیر

جواہر القرآن

از افاداتِ حضرت مولانا حسین علی رحمۃ اللہ

مرتبہ

شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان رحمۃ اللہ

کتب خانہ رشیدیہ
مدینہ مارکیٹ راولپنڈی

القرآن الحکیم

مع تفسیر

جواہر القرآن

از افادات شیخ التفسیر حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

ترمیم، اضافہ

مرتبہ

شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب

فوائد موضح قرآن ۔ مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رح

فوائد فتح الرحمن از مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

کتب خانہ رشیدیہ مدینہ مارکیٹ راولپنڈی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کاشر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الفَاتِحَة

خلاصہ سورۂ فاتحہ کے بہت سے نام ہیں جن میں سے "اُمُّ الْقُرْاٰن" سب سے زیادہ جامع اور مشہور ہے۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اُم کے معنی یہاں مغز اور خلاصہ کے ہیں۔ یہ سورت چونکہ ان تمام مضامین کا خلاصہ ہے جو سارے قرآن میں بالتفصیل مذکور ہیں اس لئے یہ سورۂ مبارکہ ام القرآن کے نام سے موسوم کی گئی۔ اس کی دو تقریریں ہیں۔

پہلی تقریر مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے اس کی تقریر یہ فرمائی کہ قرآن مجید میں چھ مضامین بیان کئے گئے ہیں (۱) توحید (۲) رسالت (۳) احکام (۴) قیامت، (۵) ماننے والوں کے احوال اور (۶) نہ ماننے والوں کے احوال۔ اور سورۃ فاتحہ میں یہ تمام مضامین بالاجمال موجود ہیں۔ الحمد للہ سے الرحمٰن الرحیم تک توحید۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں قیامت، اِيَّاكَ نَعْبُدُ اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں احکام کا بیان ہے کیونکہ نعبد میں عبادت کے تمام طریق اور احکام کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح الصراط المستقیم سے شریعت کے تمام احکام مراد ہیں۔ صراط الذین انعمت علیہم میں ایک طرف رسالت کا بیان ہے کیوں کہ منعم علیہم چار جماعتیں ہیں جن میں انبیاء علیہم السلام سرفہرست ہیں۔ جیساکہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے اولٰئك الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصلحين وحسن اولٰئك رفيقا (نساء ع۹) اور دوسری طرف ماننے والوں کے احوال کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ماننے والوں کو ہر قسم کے انعام واکرام سے نوازا جائے گا۔ اور غیر المغضوب علیہم ولا الضآلین میں نہ ماننے والوں کا ذکر ہے۔ اس طرح یہ سورت قرآن مجید کے تمام مضامین کا خلاصہ ہے اور اسی بناپر اس کا نام ام القرآن ہے۔

دوسری تقریر دوسری تقریر ہمارے شیخ حضرت مولانا حسین علی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت امام ربانی رحمۃ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ نیز تفسیر مواہب الرحمان ج اص۲ میں ہے کہ سارے آسمانی علوم اور قرآن مجید کا خلاصہ سورہ فاتحہ میں موجود ہے۔ آہ کیوں کہ مضامین کے اعتبار سے قرآن مجید کے چار حصے ہیں اور ہر حصہ الحمد للہ سے شروع ہوتا ہے۔ پہلا حصہ سورۂ فاتحہ سے سورۂ مائدہ کے آخر تک ہے اس حصہ میں زیادہ تر خالقیت کا بیان ہے یعنی ساری کائنات کا پیدا کرنے والا صرف اللہ ہی ہے اور کوئی نہیں۔ دوسرا حصہ سورہ انعام سے سورہ بنی اسرائیل کے آخر تک ہے اس حصہ کا مرکزی مضمون ربوبیت ہے یعنی اس میں زیادہ تر یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر چیز کو پیدا کرنے کے بعد اس کو حد کمال تک پہنچانے والا اور ہر چیز کی دیکھ بھال کرنے والا صرف اللہ تعالےٰ ہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ تیسرا حصہ۔ سورہ کہف سے سورہ احزاب کے آخر تک ہے اس میں زیادہ تر یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ تخت بادشاہی پر وہ خود متمکن ہے وہی مالک ومتصرف اور مختار وکارساز ہے اور وہی برکات دہندہ ہے اور وہ اپنی بادشاہی میں اپنے تصرفات اور اختیارات میں کسی کو شریک نہیں بناتا۔ چوتھا حصہ۔ سورہ سبا سے قرآن مجید کے آخر تک ہے۔ اس حصے کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ قیامت کے دن مالک ومختار صرف اللہ ہی ہوگا۔ اور اس کے سامنے کوئی شفیع غالب نہیں ہوگا۔ یہ چاروں مضامین جو پورے قرآن میں تفصیل سے مذکور ہیں ان کا خلاصہ اور اجمالی خاکہ سورۂ فاتحہ میں موجود ہے چنانچہ الحمد للہ میں حصہ اول کی طرف اشارہ ہے کیونکہ لفظ اللہ سے وصف مشہور مراد ہے یعنی خالق بمطابق قاعدہ مشہورہ لکل فرعون موسٰی ای لکل مبطل محق مشرکین عرب بھی اللہ تعالےٰ کی صفت خالقیت کا اقرار کرتے تھے جیساکہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (زخرف ع۷) اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ (ان کو) اللہ تعالےٰ نے (پیدا کیا ہے)

دوسری جگہ ارشاد ہے

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (لقمان ع۳) اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالےٰ نے

دوسرا حصہ رب العٰلمین میں مذکور ہے اور تیسرے حصہ کی طرف الرحمٰن الرحیم میں اشارہ ہے یعنی مالک ومختار اور تخت حکومت پر وہی متمکن ہے کیونکہ انتہائی رحمت اور غایت شفقت بادشاہوں ہی کی صفتیں ہیں۔

اور چوتھا حصہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں مذکور ہے۔ نیز حضرت عبداللہ بن عباس سے منقول ہے لکل شئ لباب ولباب القرآن الحوامیم (خازن ص۴۳ ج ۶) یعنی ہر چیز کا ایک خلاصہ ہوتا ہے۔ اور قرآن کا خلاصہ حوامیم ہیں۔ اور تمام حوامیم کا مبدا سورۂ زمر ہے۔ اور سورہ زمر کا دعوٰی یہ ہے کہ عبادت صرف اللہ ہی کی کرو اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (زمر ع۱) سو آپ خالص اعتقاد کر کے اللہ کی بندگی کرتے رہیے۔ یاد رکھو عبادت جو کہ (شرک سے) خالص ہو اللہ ہی

کے لیے سزاوار ہے اس آیت میں بقرینہ فاعبد اللہ الدین کے معنی عبادت کے ہیں اور عبادت سے مراد غائبانہ دعا و پکار ہے جیسا کہ حم مومن میں اس کی وضاحت کی گئی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ فَادْعُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ (حم مومن ع ۷) سو تم سب خالص اعتقاد کر کے اس کو پکارا کرو یہاں اعبدوا کے بجائے ادعوا فرما کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ عبادت سے مراد دعا و پکار ہے اور پکار عبادت کا جزو اعظم ہے جیسا کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ الدعاء ھو العبادۃ اور الدعاء مخ العبادۃ — اسی طرح حم مومن رکوع ۶ میں ہے۔ وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ (حم مومن ۶ع) اور تمہارے پروردگار نے فرما دیا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا جو لوگ صرف میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب (مرتے ہی) ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے) آں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا عن عبادتی قال عن دعائی (ابن جریر ص ۴۷ ج ۲۴) یعنی عن عبادتی میں عبادت سے مراد دعا اور پکار ہے۔ اور حوامیم سبعہ کا دعویٰ یہی ہے کہ حاجات و مشکلات میں غائبانہ صرف اللہ ہی کو پکارو اور صرف اسی سے استمداد اور استعانت کرو۔ سورہ زمر کا خلاصہ سورہ فاتحہ میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں آگیا اور حوامیم سبعہ کا خلاصہ سورہ فاتحہ کے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں آگیا۔ اس طرح سارے قرآن کا خلاصہ سورہ فاتحہ میں آگیا۔ سورہ فاتحہ کے خلاصہ اور دعویٰ کو سورہ جن رکوع ۲ میں اس طرح بیان فرمایا ہے قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِکُ بِهٖٓ اَحَدًا کہہ دیجئے کہ میں تو صرف اپنے پروردگار ہی کو (غائبانہ حاجات میں) پکارتا ہوں اور (اس کی پکار میں) کسی کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرتا ہوں۔ بعینہٖ اس مفہوم کو علامہ ابن کثیر نے اس طرح بیان فرمایا ہے الفاتحۃ سر القرآن وسرھا ھذہ الکلمۃ (اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ) یعنی سورہ فاتحہ تمام قرآن کا مغز ہے اور سورہ فاتحہ کا مغز اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہے

سوال یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا چوتھا حصہ جو سورہ سبا سے شروع ہوتا ہے اس کی ابتدا الحمد للہ سے ہوتی ہے۔ اور اس حصہ کی دوسری سورت یعنی سورہ فاطر وہ بھی الحمد للہ سے شروع کی گئی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب تو اس کا جواب یہ ہے کہ چوتھے حصہ میں دو مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ قیامت کے دن کوئی شفیع قہری نہیں ہوگا اور دوسرا یہ کہ عبادت اور پکار صرف اللہ ہی کی چاہیے اور کسی کی نہیں۔ اس طرح یہ دونوں سورتیں آپس میں بھی مرتبط ہوگئیں۔ یعنی جب خدا کے یہاں کوئی شفیع قہری نہیں تو عبادت اور پکار بھی اس کے سوا کسی کی نہیں چاہیئے۔ چنانچہ سورہ سبا میں شفاعت قہری کی نفی کی گئی ہے اور پھر سورہ یاسین، صافات، اور ص تینوں اس پر متفرع ہیں۔ سورہ یٰس میں فرمایا کہ ہم نے بدکردار قوموں کو پکڑا مگر کسی نے ان کو نہ چھڑایا۔ صافات میں بیان فرمایا کہ چھڑانا تو درکنار جن کے بارے میں چھڑانے کا زعم ہے یعنی انبیاء علیہم السلام وہ تو خود خدا کے سامنے زاری اور عجز و نیاز کا اظہار کر رہے ہیں۔ اور ص میں بیان کیا نہ صرف زاری کر رہے ہیں بلکہ اللہ کی طرف سے بعض جسمانی مصائب میں خود گرفتار ہیں۔ اس طرح سورہ فاطر میں عبادت اور پکار کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ اور پھر زمر اور حوامیم سبعہ میں اس کی توضیح کیگئی ہے۔ اور شبہات کا جواب دیا گیا ہے۔ سورہ سبا چونکہ یٰس صافات اور ص کا مبدأ تھی اور سورہ فاطر، زمر اور حوامیم سبعہ کا مبدأ تھی اس لیے دونوں سورتوں کو الحمد للہ سے شروع کیا گیا۔

جس طرح سارے قرآن کا خلاصہ سورہ فاتحہ میں موجود ہے اسی طرح سورہ فاتحہ کا خلاصہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں موجود ہے۔ پہلا حصہ لفظ اللہ میں مذکور ہے کیوں کہ اس سے وصف مشہور یعنی خالق مراد ہے۔ تیسرا حصہ حسب بیان سابق الرحمٰن الرحیم میں مذکور ہے۔ جب خالق بھی وہی ہے اور مالک بھی تو ظاہر ہے کہ مربی اور روزی رساں بھی وہی ہوگا اس طرح دو حصے صراحۃً اور ایک حصہ اشارۃً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں آگیا جن تینوں حصوں کا تعلق دنیا سے تھا وہ بسم اللہ میں آگئے۔ جب دنیا میں سب کا خالق اور پھر سب کا مربی اور مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے تو آخرت کا مالک اور وہاں کا متصرف و مختار بھی وہی ہوگا۔ اور پھر ساری بسم اللہ کا خلاصہ بسم اللہ کی ب میں موجود ہے۔ گویا سارے قرآن کا اصل مقصد بار استعانت سے معلوم ہو جاتا ہے۔ ب کا متعلق محذوف ہے اور اصل عبارت اس طرح ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم استعینوا متعلق آخر میں اسلیئے نکالا گیا ہے تاکہ حصر کا فائدہ دے ای بسم اللہ استعینوا خاصۃ لا بما اشرک بہ المشرکون من عمھم وادعوہ خاصۃ لا غیرہ۔ یعنی صرف اللہ ہی کے نام سے استعانت کرو۔ اور اللہ ہی کو غائبانہ حاجات میں پکارو۔ اور مشرکین اور نہ ہی ان کو پکارو۔

تعلیم المسئلہ سورہ فاتحہ کا ایک نام تعلیم المسئلہ بھی ہے۔ جس کے معنی ہیں "سوال کی تعلیم" سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو سوال کی تعلیم دی ہے کہ تم مجھ سے یوں سوال کیا کرو اس لیے اس سورت کو تعلیم المسئلہ بھی کہا گیا چنانچہ پوری سورہ فاتحہ میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ ساری کی ساری ایک عاجزانہ درخواست ہے جو بندہ اپنے مولا کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ پہلے اس کی حمد و ثنا بجا لاتا ہے۔ اس کے لائق ہر خوبی ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ اس کے خالق و مالک اور ساری کائنات کا پروردگار اور رحمان و رحیم اور مالک روز جزا ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ اور پھر اپنی بندگی اور بے چارگی کا اعتراف کر کے اس سے سیدھی راہ پر قائم رہنے کی توفیق مانگتا ہے۔ یہ بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی انتہائی شفقت اور مہربانی ہے۔ کہ بندوں کو سوال کرنے کا طریقہ بھی سکھا دیا۔

چونکہ سورہ فاتحہ میں بندوں کو سوال کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس لیے اس سے پہلے لفظ قُوْلُوْا (یوں کہو) محذوف ہے اور پھر تعریفی اور دعائیہ جملوں کی ابتدا میں بھی قُوْلُوْا محذوف ہے۔ مثلاً قولوا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نستعین قولوا الحمد للہ رب العٰلمین الرحمٰن الرحیم مٰلک یوم الدین۔ قولوا ایاک نعبد۔ قولوا وایاک نستعین۔ قولوا اھدنا الصراط المستقیم الخ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں سورہ فاتحہ کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

قال تعالیٰ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ای قولوا بسم اللہ الخ ومعناہ باللہ استعین خاصۃ وادعوہ خاصۃ لا غیرہ واتلبس بذکر اسمہ۔ نسمی ھٰذہ الطریق فی اصطلاحنا ادماجًا ای استعین باللہ الرحمٰن الرحیم لانہ ھو الخالق المالک وفھم المعنی الوصفی من العلم لشھرتہ بھٰذا الوصف قال تعالیٰ وھو اللہ فی السمٰوٰت وفی الارض فقال تعالیٰ وھو الذی فی السماء الٰہ وفی الارض الٰہ فھو الخالق المالک الرحمٰن الرحیم۔ اعلم یا اخی ان جمیع القرآن منقسم الی اربعۃ ابحاث کل بحث یبتدأ بالحمد للہ الاول من فاتحۃ الکتاب الی اٰخر سورۃ النساء والثانی من الانعام الی اٰخر سورۃ بنی اسرائیل والثالث من الکہف الی اٰخر الاحزاب والرابع من السبا الی اٰخر القرآن۔ فاجتمعت المضامین الاربعۃ فی الفاتحۃ والفاتحۃ فی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وبلفظ اٰخر تمام القرآن فی الفاتحۃ فان لباب القرآن الحوامیم وخلاصۃ الحوامیم فی حٰمٓ المؤمن ای اُدْعُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ کما نبینہ فی تفسیر الحوامیم وذکر فی السورۃ السابقۃ انہ تعالیٰ ھو الخالق لا غیرہ فاعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین وھٰذا المذکور ثابت فی الفاتحۃ والفاتحۃ فی بسم اللہ وبسم اللہ فی الباء کان لفظۃ اللہ جمعت فیہ الالوھیۃ والربوبیۃ والمقصود من الحصر فی الحمد لہ ھو حصر العبادۃ التی اعظم شعابھا الاستعانۃ فاذا قرأ القاری بسم اللہ استعین بتقدیم الجار فھو حصر الاستعانۃ ای بسم اللہ

استعین لا بما اشرک بہ المشرکون۔ فالفاتحۃ جامعۃ لام القرآن وھی فی البسملۃ والبسملۃ فی الباء نقل عن علی رضی اللہ عنہ ان الجامع فی بسم اللہ جامعۃ کذا فی المکتوبات للامام الربانی قدس سرہ واللہ اعلم بالصواب فشروع القرآن بجمع الاستعانۃ والختم علی قل ھو اللہ احد وقل اعوذ برب الناس فالشروع بالاستعانۃ منہ والختم علیہا کذا اسئلۃ رب العلمین فی الاشجار الاتری الی حبۃ تنبت فالمبدأ والمنتھی الثمرۃ التی ھی الحبۃ وھذا یشعر ان المبدأ منہ والیہ المرجع والمصیر۔

۵۲ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تفسیروں اور فنون کی کتابوں میں یہ بحث نہایت تفصیل سے مذکور ہے الحمد میں الف لام استغراق کے لیے ہے۔ پھر اس پر اعتراضات اور ان کے جوابات کا ایک طویل سلسلہ ہے جو ختم ہونے پر نہیں آتا۔ مثلاً اس پر ایک اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ اگر الف لام استغراق کے لیے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا تمام صفتوں اور خوبیوں کا مالک اللہ تعالے ہے لہذا اللہ کے سوا اس کی مخلوق میں سے کسی میں بھی کوئی صفت اور خوبی موجود نہیں ہوگی۔ حالانکہ یہ بات صحیح نہیں بلکہ اللہ کی مخلوق میں بھی ہزاروں صفتیں موجود ہیں اور خود قرآن میں مخلوق کی صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کئی صفتیں مثلاً۔ رؤف ورحیم، سراج منیر، بشیر و نذیر وغیرہ قرآن میں موجود ہیں۔ آپ کے سوا انبیاء علیہم السلام کی کئی صفات مومنین صالحین اور حضرت جبریل علیہ السلام کے بعض اوصاف کا بھی خود قرآن مجید میں ذکر موجود ہے۔ علاوہ ازیں کافروں میں بھی بعض قابل تعریف خوبیاں موجود ہوتی ہیں

تو اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ مخلوق میں جو صفات ہیں ان کا خالق اللہ تعالے ہی ہے نیز یہ صفات عارضی ہوتی ہیں یعنی مخلوق کی موت و فنا پر وہ صفتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ دائمی اور مستقل نہیں ہوتیں مگر اللہ تعالے کی صفات دائمی اور مستقل ہیں۔ ان کو فنا نہیں وہ ازلی اور ابدی ہیں۔ مخلوق کی صفات کا سرچشمہ اور ان کا خالق اور معطی اللہ تعالے ہے۔ اور مخلوق کی تمام صفات کا مرجع اللہ تعالے ہے اس لیے تمام صفتوں اور خوبیوں کا مالک اور سزاوار درحقیقت اللہ تعالے ہی ہے

لیکن حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اپنے مخصوص طرز کے مطابق کہ "ہر لفظ اور آیت کی ایسی مراد بیان کی جائے کہ جس پر کوئی اعتراض وارد ہی نہ ہو سکے" فرماتے ہیں کہ الحمد میں الف لام استغراق کے لیے نہیں بلکہ جنس اور عہد خارجی کے لیے ہے۔ اور قاعدہ نحو کے مطابق الف لام کا حقیقی معنی ہے ہی جنس اور عہد خارجی استغراق کو محققین نے الف لام کا مجازی محمل قرار دیا ہے۔ اور اس سے صرف وہی صفات مراد ہیں جو ذات باری تعالے کے ساتھ مختص ہیں اور مخلوق میں نہیں پائی جاتی ہیں یعنی صفات کارسازی یا بالفاظ دیگر صفات فاعلیہ یا صفات مافوق الاسباب مثلاً مالک و مختار، متصرف و کارساز حاجت روا، مشکلکشا اور دور و نزدیک سے یکساں طور پر سمیع و بصیر ہونا وغیرہ مطلب یہ ہے کہ تمام صفات الوہیت اللہ تعالی کے ساتھ مختص ہیں اور ان میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس صورت میں نہ کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے اور نہ ہی جواب دینے کی زحمت اٹھانا پڑتی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالے نے جا بجا اپنی صفات الوہیت بیان فرمائی ہیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:۔

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ (نمل ع ۵) کہہ دیجئے اللہ کے سوا نہ آسمان والے غیب جانتے ہیں نہ زمین والے

اس آیت میں اللہ تعالی کی صفت علم غیب کا ذکر ہے جو صفات الوہیت میں سے ہے۔ ایک جگہ فرمایا وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗٓ اِلَّا ھُوَ وَاِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِہٖ (یونس ع ۱۱) اس میں بیان فرمایا کہ نقصان کا مالک صرف اللہ ہے۔ اس کے بغیر نہ کوئی نفع دے سکتا ہے اور نہ کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے ایک جگہ ارشاد ہے کہ ساری مخلوق پر صبح و شام مختلف انعامات کی جو بارش ہوتی رہتی ہے۔ وہ بھی اللہ کی طرف سے ہے چنانچہ فرمایا وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ (نحل ع ۷) یعنی تمہارے پاس جتنی بھی نعمتیں ہیں وہ سب اللہ کی طرف سے ہیں ایک جگہ فرمایا یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْكُمْ ھَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰہِ یَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (فاطر ع ۱) اے لوگو اللہ کی وہ نعمتیں یاد کرو جو اس نے تم پر کی ہیں۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور پیدا کرنے والا ہے۔ جو زمین و آسمان سے تمہیں روزی مہیا کرتا ہے۔ (یاد رکھو) اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس میں اللہ تعالے نے اپنے خالق و رزاق اور منعم و مربی ہونے کی صفات کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ اور مذکورہ بالا تمام صفات الوہیت ہیں۔

ان کے علاوہ اور سینکڑوں آیتوں میں اللہ تعالے کی صفات مخصوصہ بیان کی گئی ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالے کی یہ تمام صفات مافوق الاسباب ہیں اور عالم غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہاں یہ بات سمجھ لی جائے کہ نظام عالم میں جو کام ہو رہے ہیں وہ دو حالتوں سے خالی نہیں ہیں وہ یا تو ماتحت الاسباب ہیں یعنی اپنے اسباب عادیہ کے تحت انجام پذیر ہو رہے ہیں مثلاً بینائی و شنوائی رکھنے والا آدمی اپنے اردگرد کی چیزوں کو دیکھ سکتا ہے اور قرب و جوار کی آوازیں سن سکتا ہے یا مثلاً ایک آدمی اناج یا پھل اگانا چاہتا ہے تو وہ اس کام کے لئے اسباب استعمال کرتا ہے یعنی زمین میں ہل چلا کر اسے قابل کاشت بناتا ہے۔ پھر اس میں بیج ڈالتا ہے، اسے پانی دیتا ہے اس کی نلائی وغیرہ کرتا ہے۔ یہ تمام اسباب عادیہ ہیں ان کو استعمال میں لائے بغیر کام نہیں بن سکتا۔ دوسری قسم کے کام وہ ہیں جو مافوق الاسباب ہیں یعنی ان اسباب عادیہ سے بالاتر ہیں۔ مثلاً ساری کائنات کے ذرے ذرے کو ہر وقت دیکھنا زمین و آسمان کی چھپی ہوئی تمام چیزوں کا ہر آن مشاہدہ کرنا اسباب عادیہ سے بالاتر اور ماوراء ہے اسی طرح زمین کے پیٹ میں پڑے بیجوں اور تخموں کو شق کر کے ان سے پودوں کی شاخیں نکالنا انسانی دسترس سے باہر اور اسباب عادیہ سے بالاتر ہے تو معلوم ہوا کہ انسانی دسترس میں صرف وہی کام ہیں جو ماتحت الاسباب ہیں اور ما فوق الاسباب سارے امور صرف اللہ تعالی ہی کی قدرت کے تحت داخل ہیں لہذا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے مراد وہ تمام صفات ہیں جو مافوق الاسباب ہیں یعنی مافوق الاسباب تمام صفتیں اور خوبیاں اللہ تعالی کے ساتھ مختص ہیں اور ان میں سے ایک صفت اور ایک خوبی بھی اللہ کے سوا کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔ مشرکین مکہ چونکہ انہی صفات الوہیت یا مافوق الاسباب صفات ہی میں اپنے معبودوں کو خدا کا شریک سمجھتے تھے۔ اس لئے الحمد میں مشرکین کے اسی خیال باطل کی تردید فرمائی گئی ہے کہ تمام مافوق الاسباب صفات اللہ تعالی کے ساتھ خاص ہیں۔

قرآن مجید میں جہاں کہیں جملہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ واقع ہوا ہے وہاں سیاق و سباق سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مشرکین کے اسی خیال کی تردید ہے کہ ان کے مزعومہ معبود مافوق الاسباب صفات کے حامل ہیں۔ چنانچہ سورۂ انعام ع ۵ میں ارشاد ہے فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (پھر ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی اور تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے) اس سے پہلے اللہ تعالی نے اپنی صفات کارسازی کا ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً مصیبت کے وقت وہی کام آتا ہے، خدا کی گرفت زبردست ہے، ظالموں کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ آخر میں فرمایا "الحمد للہ" یعنی یہ تمام صفات کارسازی اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ یہاں اگر الحمد کو صفات کارسازی سے مختص نہ کیا جائے تو ما قبل سے اس آیت کا کوئی ربط باقی نہیں رہتا۔ اور سورۂ نمل ع ۵ میں ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی (تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے سزاوار ہیں اور اس کے بندوں پر سلام ہو جن کو اس نے منتخب فرمایا ہے) اس آیت سے پہلے حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر ہے کہ اس تکذیب کرنے والی قوم کو کس طرح تباہ کیا گیا اور ایمان والوں کو کس طرح بچایا گیا چنانچہ ارشاد ہے۔ اَنَّا دَمَّرْنٰھُمْ وَقَوْمَھُمْ اَجْمَعِیْنَ (ہم نے ان (نو غنڈوں) اور ان کی ساری قوم کو تباہ کر دیا) اور مومنین کے بارے میں فرمایا وَاَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ۝ (اور ہم نے ان ایمان والوں کو جو ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہتے تھے بچا لیا)

اس کے بعد مؤمنین لوط اور منکرین لوط علیہ السلام کے بارے میں فرمایا فَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ (تو ہم نے لوط علیہ السلام اور اس کے اہل کو اس کی بیوی کے سوا بچالیا) اور فَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا (اور ان کے منکرین پر ایک نئی طرح کا مینہ برسایا) حضرت صالح اور حضرت لوط علیہما السلام اور ان کی مومن قوم کو نجات دینے اور ان کے منکرین کو تباہ و برباد کرنے کا ذکر کرکے آخر میں فرمایا۔ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰى یعنی نیک بندوں کو سلامتی عطا کرنا اور کافروں کو ہلاک کرنا یہ صفتیں اللہ ہی کی ہیں۔ اللہ کے نیک بندوں پر اللہ کی طرف سے سلامتی تو نازل ہوتی ہے لیکن وہ کارساز اور متصرف و مختار نہیں ہوتے۔

اور سورہ جاثیہ کے آخری رکوع میں ارشاد ہوتا ہے۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (سو تمام خوبیاں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں جو مالک ہے آسمانوں کا اور مالک ہے زمین کا مالک تمام جہانوں کا) یہاں بھی صاف فرمادیا کہ زمین و آسمان کا مالک و مختار اور ساری کائنات کا کارساز اللہ ہی ہے اور صفات کارسازی اسی کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان میں کوئی اسکا شریک نہیں۔

اور سورہ صافات میں انبیاء علیہم السلام کے مختلف واقعات بیان کرنے کے بعد آخر میں فرمایا۔ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (اور سلامتی ہے تمام پیغمبروں پر اور تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے) مطلب یہ کہ تباہی اور عذاب سے رسولوں کو سلامت رکھنا اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کرنا یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے پیغمبر و لکا نہیں حاصل یہ کہ تمام مافوق الاسباب اور غائبانہ طاقتوں کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور تمام صفات الوہیت اسی کی ذات مقدسہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مشرکین نے اپنے زعم باطل میں اللہ کے جن پیغمبروں اور نیک بندوں کو غائبانہ اور مافوق الاسباب طاقتوں میں خدا کا شریک سمجھ رکھا ہے وہ خود اللہ کے محتاج ہیں۔ اور آڑے وقت ان کے کام نہیں آسکتے۔

۳ه رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لفظ اللہ ذات باری تعالیٰ کا اسم عَلَم ہے لیکن یہاں اس سے وصف مشہور مراد ہے یعنی خالق اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ مع صفات باقیہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی دلیل بھی اس میں موجود ہے یعنی تمام صفات کارسازی اور تمام اوصاف الوہیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ کیونکہ وہ خالق ہے وہ رب العالمین ہے۔ وہ رحمان و رحیم ہے اور وہ مالک روز جزا ہے۔ اور اس کے سوا زمین و آسمان میں کوئی ایسی ہستی نہیں جو ان تمام صفات یا ان میں سے کسی ایک صفت سے متصف ہو۔ سورہ انعام رکوع نمبر ایک میں ارشاد ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ (تمام خوبیاں اس اللہ کے لیے زیبا ہیں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ اور اندھیروں اور اجالے کو بنایا) اس میں الذین موصول اپنے صلہ سے مل کر بمنزلہ علت ہے یعنی جب آسمانوں اور زمین کا خالق اور اندھیروں اور اجالے کو پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ تو صفات کارسازی بھی اسی کی ذات سے مختص ہیں کسی اور کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ اس کے متصل بعد فرمایا۔ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ (پھر کافر لوگ (اپنے باطل معبودوں کو) اپنے پروردگار کے برابر قرار دیتے ہیں۔ اس سے بھی اسی حقیقت کو واضح فرمایا کہ جب ارض و سما اور لیل و نہار کا خالق اللہ ہے تو صفات کارسازی کا مالک بھی تنہا وہی ہے۔ اگر اس کے سوا کوئی اور خالق نہیں تو لامحالہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کے سوا کارساز اور مافوق الاسباب متصرف اور مختار بھی کوئی نہیں مخفی نہ رہے کہ الحمد للہ ایک دعوے ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمام صفات کارسازی کا مستحق صرف اللہ ہے۔ اس کے بعد رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ یہ سب اس دعویٰ کی دلیلیں ہیں۔ ۳ه رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ لفظ اللہ سے چونکہ وصفی معنی مراد تھے یعنی خالق اس لئے اس کی مناسبت سے اس کے بعد دوسری صفت رب العلمین لائی گئی کیونکہ ہر مخلوق اپنی وجود کے لئے اپنی خالق کی محتاج ہیں طرح بقا و وجود کے لئے رب اور پروردگار کی محتاج ہے۔ رب کے معنی ہیں ہر چیز کو بتدریج اس کی حد کمال تک پہنچانے والا اور موقع کے مطابق اس کی ضرورتیں مہیا کرنے والا اور اسے زائلوں سے بچانے والا جیسا کہ امام سلمی حنفی نے امام واسطی سے نقل کیا ہے ھو الخالق ابتداء و مربی غذاءً والغافر انتہاءً وھو اسم اللہ الاعظم (مدارک ج ا ص ۲)

اَلْعٰلَمِیْنَ عالم کی جمع ہے اور اسم آلہ کا صیغہ ہے اور یہاں اس سے ہر وہ چیز مراد ہے جس کے وجود سے خالق کائنات کے وجود پر استدلال کیا جاسکے خواہ وہ انسان ہو یا دیگر حیوانات، نباتات ہوں یا جمادات۔ چنانچہ امام نسفی فرماتے ہیں والعالم کل ما علم بہ الخالق من الاجسام والجواھر والاعراض او کل موجود سوی اللہ تعالیٰ سمی بہ لانہ علم علی وجودہ الخ (مدارک ص ۲ ج ا) غرضیکہ ہر وہ چیز جو خلعت وجود میں ملبوس ہے اور جس کا انسان آنکھوں سے مشاہدہ کرسکتا ہے۔ یا دیگر حواس کے ذریعے ان کا وجود محسوس کرسکتا ہے۔ وہ سب العالمین کے جامع لفظ میں داخل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا نظام ربوبیت مخلوق کی ہر نوع کو شامل ہے اور کائنات عالم کا ایک ذرہ بھی اس کی ربوبیت سے مستغنی نہیں جس طرح ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح ہر چیز کا مربی اور محافظ بھی وہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا نظامِ ربوبیت

تمام انسانوں کا پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ نطفہ سے لے کر طفل تک اور طفل سے لے کر بڑھاپے تک تمام منازل سے انسان کو وہی گزارتا ہے اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ نہایت اختصار سے اس حقیقت کو بیان فرمایا اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّشَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ (روم ع ۶) اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا تم کو ناتوانی کی حالت میں پھر ناتوانی کی حالت کے بعد توانائی عطا کی پھر توانائی کے بعد ضعف اور بڑھاپا کیا۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ جاننے والا قوت رکھنے والا ہے) زمین و آسمان کا خالق اور کائنات کے ذرے ذرے کا پیدا کرنے والا وہی ہے۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (تغابن ع ۱) اسی نے آسمانوں اور زمین کو ٹھیک طور پر پیدا کیا اور تمہارا نقشہ بنایا اور عمدہ نقشہ بنایا) اور ایک جگہ فرمایا وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا (فرقان ع ۱) اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر سب کو الگ الگ اندازہ پر رکھا۔ اور ایک جگہ ارشاد ہے۔ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ ۙ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ۝ (زمر ع ۶) (اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے) ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ عالم کے ذرے ذرے کا خالق اللہ ہی ہے اور اللہ کے سوا کوئی اور خالق نہیں اسی طرح اللہ کی ربوبیت بھی عام ہے اور ساری کائنات اسکے نظام ربوبیت کے تحت داخل ہے چنانچہ اللہ نے اپنی ربوبیت عامہ کا اس طرح اعلان فرمایا:۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا (شعراء ع ۲) وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو مخلوقات ان کے درمیان ہے اس کا اور ایک جگہ فرمایا۔ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ (انعام ع ۲۰)۔ کہدیجئے کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کیلیے تلاش کروں حالانکہ وہ ہر چیز کا رب ہے۔ انسان اور دیگر حیوانات کیلیے اللہ کس طرح روزی بہم پہنچاتا ہے۔ اس کا ذکر اس طرح فرمایا فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا وَّزَیْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (عبس ع ۱) سو انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی طرف دیکھے کہ ہم نے عجیب طور پر پانی

اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا تمہارے اور تمہارے مواشی کے فائدہ کے لیے)

مندرجہ بالا آیات سے بخوبی واضح ہوگیا کہ اللہ تعالےٰ کا نظام ربوبیت ساری کائنات پر حاوی ہے۔ اور انسان سے لے کر تمام حیوانات۔ نباتات۔ جمادات۔ خدا کی ساری نوری ناری اور خاکی مخلوق۔ علویات اور سفلیات سب کا خالق و مربی و محافظ او پروردگار وہی ہے۔

٥ اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ یہ دونوں صفت مشبہ کے صیغے ہیں اور دونوں میں مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اور دونوں رحم سے مشتق ہیں مفسرین کرام نے دونوں لفظوں کے مفہوم میں مختلف طریقوں سے فرق بیان فرمایا ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ رحمان دنیا کے اعتبار سے ہے اور رحیم آخرت کے اعتبار سے یعنی دنیا میں اس کی رحمت مومنوں اور کافروں کے لیے عام ہے۔ دنیا میں دنیوی فوائد سے مومن اور کافر یکساں طور پر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ اس کی صفت رحمان کا اثر ہے اور آخرت میں اس کی رحمت مومنوں کے ساتھ مخصوص ہوگی اور کافر اس سے محروم رہیں گے۔ یہ اس کی صفت رحیم کا اثر ہوگا۔ جاء فی الدعاء یا رحمن الدنیا لانہ یعم المؤمن والکافر و رحیم الاٰخرۃ لانہ یخص المؤمن (مدارک صـ۵ ج ۱) حضرت شیخ رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے دونوں صفتوں ایک نہایت لطیف فرق بیان فرمایا کہ رحمان اس موصوف کو کہتے ہیں جو بالفعل رحمت کر رہا ہو اور جس کی رحمت کائنات کے ذرہ ذرہ کو شامل ہو۔ اور رحیم (صیغہ صفت مشبہ) اس ذات کو کہتے ہیں۔ رحم جس کی صفت لازمہ اور خصوصیت ذاتیہ ہو صفت عارضہ نہ ہو تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ جو بالفعل ہر آن میں اپنی ساری مخلوق پر رحم فرما رہا ہے۔ یہ رحم اس کی ذات پاک کو لازم ہے اور اس کی صفت ذاتیہ ہے۔ اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرنے کیلئے رحمان کے بعد رحیم کو بھی ذکر کیا گیا۔

رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ کے بعد الرحمٰن الرحیم کا ذکر کر کے اس طرف اشارہ فرمایا کہ نظام ربوبیت کے بعد تمام نظام عالم اللہ تعالےٰ کی صفت رحم کا ظہور ہے گویا یہ تمام کارگاہ عالم اور یہ ساری کائنات صرف اس لیے بنی ہے تاکہ اس سے ہمیں فائدہ پہنچے اور ہماری ضرورتیں پوری ہوں اس مضمون کو اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ تفصیل سے بیان فرمایا ہے ایک جگہ ارشاد ہے۔ وَسَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ (جاثیہ ع ۲) (اور تابع کیا اس نے تمہارے (فائدے) کے لیے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں سارا اپنے حکم سے یقیناً اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں)

نہ صرف زمین و آسمان کے درمیانی خلاء میں بلکہ زمین کے پیٹ میں بھی اس نے اپنی رحمت و نعمت کے بے شمار خزانے اپنی مخلوق کے لیے مخفی کر رکھے ہیں۔ جو محض اس کی شفقت سے اور مہربانی سے زمین کی سطح پر نمودار ہوتے ہیں۔ اور اس کی ساری مخلوق ان سے فائدہ اٹھاتی ہے زمین کی سطح پھلوں پھولوں، غلہ، ترکاریوں اور میووں سے مالامال ہے اور پانی کے شفاف اور شیریں چشمے اس کے پیٹ سے ابل کر اس کی سطح پر بہ رہے ہیں۔ اور زمین کی گہرائیاں سونے چاندی اور دیگر قیمتی معدنیات سے پُر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَہُوَ الَّذِیۡ مَدَّ الۡاَرۡضَ وَجَعَلَ فِیۡہَا رَوَاسِیَ وَاَنۡہٰرًا ؕ وَمِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیۡہَا زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّہَارَ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ۝ وَفِی الۡاَرۡضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّزَرۡعٌ وَّنَخِیۡلٌ صِنۡوَانٌ وَّغَیۡرُ صِنۡوَانٍ یُّسۡقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۟ وَنُفَضِّلُ بَعۡضَہَا عَلٰی بَعۡضٍ فِی الۡاُکُلِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝ (سورہ رعد ع ۱) (اور وہ ایسا ہے کہ اس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور نہریں پیدا کیں اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسم کے پیدا کیے۔ شب کو دن سے چھپا دیتا ہے۔ بیشک ان (مذکورہ بالا امور) میں سوچنے والوں کے لیے (توحید کے) دلائل موجود ہیں اور زمین میں پاس پاس مختلف خطے اور انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں ہیں جن میں سے بعضی تو اوپر جا کر دو تنے ہو جاتی ہیں۔ اور بعضی میں دو تنے نہیں ہوتے۔ سب کو ایک ہی طرح کا پانی دیا جاتا ہے۔ اور ہم ایک کو دوسرے پر پھلوں میں فوقیت دیتے ہیں ان امور میں بھی سمجھداروں کے لیے (توحید کے) دلائل ہیں)

خشکی کے علاوہ تری میں بھی اس کی رحمت عامہ کے آثار نمایاں اور ہویدا ہیں مثال کے طور پر سمندروں کی سطح جہازوں اور کشتیوں کے ذریعے نقل و حرکت اور آمد و رفت کے لیے ایک اعلیٰ شاہراہ کا کام دیتی ہے۔ اور اس کی گہرائی موتیوں اور دیگر مفید اور قیمتی اشیاء سے مالامال ہے۔ نیز دریاؤں اور سمندروں سے مچھلی کا تازہ بتازہ گوشت حاصل ہوتا ہے۔ جو انسان کے لیے بہترین غذا ہے۔ وَہُوَ الَّذِیۡ سَخَّرَ الۡبَحۡرَ لِتَاۡکُلُوۡا مِنۡہُ لَحۡمًا طَرِیًّا وَّتَسۡتَخۡرِجُوۡا مِنۡہُ حِلۡیَۃً تَلۡبَسُوۡنَہَا ۚ وَتَرَی الۡفُلۡکَ مَوَاخِرَ فِیۡہِ وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ وَلَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ (نحل ع ۲) (اور وہ ایسا ہے کہ اس نے دریا کو بھی مسخر بنایا کہ اس میں سے بھی تازہ تازہ گوشت کھاؤ اور اس میں سے (موتیوں کا) گہنا نکالو جسے تم پہنتے ہو اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ اس میں پانی کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی ہیں۔ اور تاکہ تم خدا کی روزی تلاش کرو (جو اس نے پیدا کی ہوئی) اور تاکہ تم شکر کرو) ان آیتوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالےٰ نے اس جہان کا ذرہ ذرہ پیدا کر کے پورے نظام عالم کو اپنے نظام ربوبیت کے تحت رکھا ہوا ہے اور اس کا نظام ربوبیت اس کے رحم و کرم اور اس کی رحمت و شفقت کے تحت چل رہا ہے۔ پورے نظام عالم کا ایک ذرہ بھی ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی رحمت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالےٰ نے جس طرح خشکی اور تری کی ساری نعمتیں عالم جسمانی کی تربیت اور پرورش کے لیے پیدا فرمائی ہیں۔ اسی طرح اس کی رحمت بے پایاں نے عالم روحانی کی ترقی اور نشوونما کے لیے بھی انتظام فرمایا اور دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کے ذریعے عالم روحانی کی غذا کا بندوبست کیا۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اپنے آخری پیغام قرآن مجید کی تعلیم کو خصوصیت سے اپنی رحمت کے ساتھ متعلق فرمایا چنانچہ ارشاد ہے وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (انبیاء ع ۷) رحمۃ ـــ اَرۡسَلۡنٰکَ کا مفعول لہٗ ہے یعنی ہم نے آپ کو اس لیے بھیجا ہے تاکہ سارے عالم پر رحم کریں۔ یا رحمۃ مصدر بمعنی صیغہ صفت اَرۡسَلۡنَا کے فاعل یا کَ ضمیر مفعول یا دونوں سے حال ہے۔ مطلب ظاہر ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ اَلرَّحۡمٰنُ ۝ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ (الرحمٰن ع ۱) رحمان نے قرآن کی تعلیم دی۔ اس نے انسان کو پیدا کیا (پھر) اس کو بولنا سکھایا۔ اس کی ربوبیت اور رحمت کس قدر عام اور حاوی ہے۔ کہ ایک طرف روح اور جسد کا تعلق باقی رکھنے کے لیئے بے شمار مادی غذائیں مہیا کیں۔ اور دوسری طرف روح کی نشوونما کے لیئے اعلیٰ درجہ کی روحانی غذائیں مہیا فرمائیں۔ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ۝

٦ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ لفظ دین قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ بعض مقامات میں پوری شریعت کو دین کہا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہے وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ (اٰل عمران ع ۹) یعنی جس نے اسلام کے سوا کسی اور دین کو پسند کر لیا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ اکثر جگہوں میں الدین اللہ کی توحید، اس کی خالص عبادت اور پکار کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ سورہ یوسف رکوع ۵ میں ہے حضرت یوسف علیہ السلام نے قیدیوں کو وعظ کرتے ہوئے فرمایا اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ ؕ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ نہیں حکم مگر اللہ کے لیے اس نے حکم دیا ہے کہ مت عبادت کرو اس کے سوا کسی کی یہی ہے دین محکم سورۂ زمر رکوع ۱ میں فرمایا اَلَا لِلّٰہِ الدِّیۡنُ الۡخَالِصُ۔ خبردار اللہ ہی کے لیے ہے خالص عبادت اور پکار۔ اور سورہ حم مومن رکوع ۲ میں فرمایا فَادۡعُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ۝ (سو اللہ کو پکارو خالص کر کے اس کے لیے عبادت کو گو کافروں کے لیے ناگوار ہی کیوں نہ ہو۔ مگر جہاں لفظ الدین یوم کا مضاف ہو وہاں اس کے معنی جزاء کے ہوتے ہیں جیسا کہ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ

میں ہے۔ یعنی روزِ جزا کا مالک اور اس دن میں تمام تصرفات اور اختیارات کا واحد مختار اور اعمال کی جزا و سزا مقرر کرنے والا اور اعمال پر نیک و بد نتائج مرتب کرنے والا اور اختیار رکھنے والا ہے مذکورہ دعویٰ یعنی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کی تیسری دلیل ہے۔

روزِ جزا کی اہمیت

اللہ تعالٰے نے ساری کائنات کو پیدا کیا اور نظام ربوبیت کے تحت ہر چیز کو انسان کی خدمت پر لگا دیا جدھر دیکھو خشکی اور تری پر اس کی رحمت اور نعمت کی چادریں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اس نے روح کی نشو و نما کا انتظام بھی فرمایا اور راہِ ہدایت اور صراطِ مستقیم بتلانے کے لیے کتابیں اور رسول بھیجے اور آخر میں اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر اپنی آخری کتاب قرآن مجید نازل فرما کر نعمت اسلام کی تکمیل فرما دی۔ اس سارے نظام ربوبیت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک ایسا دن ضرور ہونا چاہیئے جس میں اس امر کا فیصلہ ہو سکے کہ کس نے اللہ کی ان تمام نعمتوں کا شکر ادا کیا اور کس نے ناشکری کی۔ کس نے اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت پر عمل کیا۔ اور اس کے احکام کی تعمیل کی اور کس نے اس کی ہدایت کو اور اس کے احکام کو ٹھکرا دیا۔ ایسا دن تو دنیا میں ہو نہیں سکتا کیونکہ یہ دار العمل ہے اس لیے لامحالہ ایسا دن دنیا کے اختتام پر ہی ہو سکتا ہے اسی دن کا نام یوم الدین ہے اور اسی کو یوم آخر یا روزِ جزا وغیرہ کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ دن دنیا کے ختم ہونے پر آئے گا۔ اور اس میں نیک و بد اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس دن میں ہر قسم کے تمام اختیارات صرف اللہ کے قبضہ میں ہوں گے۔ وہاں مجازی طور پر بھی کسی کو کوئی اختیار یا اقتدار حاصل نہیں ہوگا۔

اہل کتاب کا تصورِ آخرت

اہل کتاب کے علماء سوء، ان کے احبار و رہبان اور ان کے پیروں اور پادریوں کو چونکہ حق چھپانے، غلط بیانی کرنے اور تورات اور انجیل کی آیتوں میں لفظی اور معنوی تحریفیں اور تبدیلیاں کرنے کی عادت پڑ چکی تھی اس لیے انہوں نے اپنے عوام میں بہت سے غلط عقائد پھیلا رکھے تھے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالٰے نے جا بجا ان کے کرتوتوں کو ظاہر فرمایا ہے۔ تاکہ امت محمدیہ اس سے عبرت حاصل کرے چنانچہ ارشاد ہے ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (بقرہ ع ۹) پھر وہ اسے سمجھ لینے کے بعد بدل ڈالتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ ایک جگہ فرمایا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ پھیر دیتے ہیں وہ کلام کو اس کے مواقع سے۔ اہل کتاب کے علماء اور گدی نشینوں کو حق پوشی سے منع فرماتے ہوئے فرمایا يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (آل عمران ع ۷) کیوں مخلوط کرتے ہو حق کو باطل کے ساتھ اور کیوں چھپاتے ہو حق کو حالانکہ تم جانتے ہو۔ یہود اور نصاریٰ کے احبار اور رہبان سوء، غیر اللہ کی نذر و نیاز اور کئی دوسرے ذرائع سے حرام مال بھی کھاتے تھے سَمّٰعُونَ لِلْكَذِبِ أَكّٰلُونَ لِلسُّحْتِ (مائدہ ع ۶) یہ لوگ غلط باتیں سننے کے عادی ہیں۔ بڑے حرام خور ہیں۔

اہل کتاب کے پادریوں اور صوفیوں نے آخرت کے بارے میں ایک نہایت ہی غلط تصور عوام کے ذہن نشین کر رکھا تھا۔ اپنے متعلق تو انہوں نے عوامی ذہن میں یہ بات بٹھا رکھی تھی کہ ہم اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں اور اللہ کے بیٹے ہیں یعنی جس طرح باپ کی صفات بیٹوں میں ہوتی ہیں۔ اسی طرح اللہ کی صفات ہم میں موجود ہیں اس لئے آخرت میں ہمیں تو کسی قسم کا عذاب ہوگا ہی نہیں وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللّٰهِ وَأَحِبَّاؤُهُ (مائدہ ع ۳) یہود اور نصاریٰ نے کہا ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ اور عوام کو انہوں نے یقین دلا رکھا تھا کہ جنت ان کے لیے ریزرو ہے ان کے سوا اور کوئی جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ قَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ (بقرہ ع ۱۴) انہوں نے کہا کہ جنت میں ہرگز داخل نہیں ہوگا مگر وہی جو یہودی ہوگا یا نصرانی۔ اور عوام کو انہوں نے یہ بھی باور کرا رکھا تھا کہ اگر ہم کو عذاب ہوا بھی تو صرف چند دنوں کے لیے ہوگا اور ہمیشہ کے لیے ہم عذاب میں نہیں رہیں گے قَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً۔ (بقرہ ع ۹) انہوں نے کہا کہ ہمیں تو صرف چند دن عذاب آئے گا۔ اہل کتاب کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ حضرت عزیر اور حضرت عیسٰے علیہما السلام اور ان کے پیر اور پادری حاجت روا، مشکل کشا اور شفیع غالب ہیں اور قیامت کے دن ان کو عذاب سے بچا لیں گے۔ اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ (توبہ رکوع ۵) انہوں نے اپنے پادریوں اور پیروں کو اور مسیح بن مریم کو خدا کے سوا رب بنا لیا تھا۔ سورۂ فاتحہ میں جس طرح دوسرے باطل عقیدوں کی تردید کی گئی ہے اسی طرح مٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ سے اہل کتاب کے غلط تصور آخرت کی تردید فرمائی کہ قیامت کے دن کا مالک تو صرف اللہ تعالٰے ہے اور اسی کے ہاتھ میں سب کا حساب و کتاب اور عذاب و ثواب ہے۔ اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھ رہے ہو اور ان کو مالک و مختار اور شفیع غالب مان رہے ہو اور جن کے بارے میں تمہارا عقیدہ ہے کہ قیامت کے دن وہ خدا کے عذاب سے چھڑا لیں گے قیامت کے دن ان کا کوئی زور نہیں چلے گا اور نہ ہی ان کو کسی قسم کے تصرف کا اختیار ہوگا۔ اور نہ ہی وہ کوئی بات منوا سکیں گے۔ کیونکہ تصرف صرف وہی کر سکتا ہے جو مالک و مختار ہو۔ اور قیامت کے دن کا مالک صرف اللہ ہی ہے اور سب کے نیک و بد اعمال کو جاننے والا بھی وہی ہے۔ اس لیے وہی لوگوں کے اعمال کی جزا و سزا کا مالک ہے وہ جس طرح چاہے اور جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کے سوا کسی میں قدرت نہیں کہ اعمال کا حساب لے اور ہر ایک کے حسب حال اور حسب نیت نیک و بد اعمال کی جزا اور سزا دے۔

یہود و نصاریٰ کے اس غلط تصور آخرت کا قرآن مجید میں تفصیلاً بھی رد کیا گیا ہے چنانچہ اہل کتاب کے اس باطل عقیدے کے رد میں کہ ہم اللہ کے پیارے ہیں اور ہمیں عذاب نہیں ہوگا اللہ تبارک تعالٰے نے فرمایا۔ لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا (نساء رکوع ۱۸) یعنی نجات نہ تو تمہاری خواہشات پر موقوف ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر بلکہ مالک الملک کا قانون یہ ہے کہ جو کوئی بھی برائی کرے گا اسے ضرور اس کا بدلہ ملے گا اور پھر وہاں اللہ کے سوا کوئی کارساز اور مددگار نہیں پائے گا۔ اور ایک جگہ فرمایا بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أُولٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ جس نے برائی کمائی اور اسے اس کے گناہوں نے گھیر لیا یہ لوگ جہنمی ہیں اور وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کیے یہ لوگ جنتی ہیں اور جنت میں ہمیشہ رہیں گے اس آیت میں لفظ کسب سے اس طرف اشارہ ہے کہ نجات اور عذاب اور ثواب و عقاب کا تعلق عمل سے ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ اعمال تو برے ہوں اور شرک سے ملوث ہوں۔ لیکن کسی پیغمبر، ولی یا بزرگ کی مدد اور سفارش سے نجات مل جائے بلکہ وہاں تو اس اصول پر عمل ہوگا۔ جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ میں لفظ مَالِكِ سے اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ اللہ تعالٰے کا فعل اور اعمال کی جزا و سزا عدل و انصاف کے عین مطابق ہے۔ لیکن اللہ تعالٰے پھر بھی مجبور نہیں بلکہ وہ مالک ہے اور اپنے ملک میں جس طرح چاہے تصرف کرے اس کے سامنے کسی کو چون چرا کرنے کی جرأت نہیں۔

دنیا و آخرت کا مالک و مختار

دنیا اور آخرت میں مالک و مختار صرف اللہ تعالٰے ہی ہے۔ لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ (انبیاء ع ۲)۔ جو کچھ وہ کرتا ہے اس سے کوئی

باز پرس نہیں کر سکتا اور اوروں سے باز پرس کی جا سکتی ہے۔ دنیا میں اگرچہ اللہ کے سوا کئی مالک مختار ہونے کے مدعی بن گئے اور مشرکین نے بھی اپنے معبودوں کو مالک و مختار سمجھے تھا۔ مگر آخرت میں مشرکین کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ غلطی پر تھے۔ حقیقت میں اللہ کے سوا کوئی مالک و مختار نہیں تھا فرعون اور نمرود جیسے سرکش حکمرانوں کو بھی قیامت کے دن معلوم ہو جائے گا کہ ان کے سب دعوے غلط تھے اور آج وہ بالکل بے بس اور بے یار و مددگار ہیں۔ ان کے اختیار میں کچھ نہیں اور تمام معاملات صرف اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ (الانفطار ع ۱) اس دن کوئی جان کسی جان کیلئے کوئی اختیار نہیں رکھے گی اور حکم صرف اللہ ہی کا ہوگا۔ اسی طرح قرآن مجید میں اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں مالک و مختار صرف اللہ ہی ہے۔

٭ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ سورۂ فاتحہ میں یہ آیت مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ إِيَّاكَ نَعْبُدُ میں إِيَّاكَ مفعول کو نَعْبُدُ فعل پر مقدم کیا گیا ہے۔ تاکہ حصر کا فائدہ دے اور مطلب یہ ہو کہ عبادت صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے۔ اور اس کے سوا کسی پیغمبر، فرشتہ یا ولی کی عبادت اور پکار نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ وہ سارے خود اللہ کے حکم سے اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ اسی طرح إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ میں فائدہ حصر کے لیے مفعول بہ کو فعل پر مقدم کیا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ مدد صرف اللہ ہی سے مانگنی چاہیے۔ اور اس کے سوا کسی پیر یا پیغمبر سے اور کسی فرشتہ یا ولی سے مافوق الاسباب امور میں مدد نہیں مانگنی چاہیئے امام ابن کثیر بعض بزرگوں سے نقل فرماتے ہیں کہ ساری قرآن کا مرکزی حصہ سورہ فاتحہ ہے اور سورہ فاتحہ کا مرکزی حصہ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ہے وہ لکھتے ہیں۔ الفاتحۃ سر القرآن وسرہا هذه الكلمة (اياك نعبد واياك نستعين) (ابن کثیر ص۲۵ ج ۱)

عبادت کا مفہوم عبادت کے مفہوم میں دو چیزیں داخل ہیں ایک غایت تذلل یعنی انتہائی عاجزی اور ذلت دوم غایت تعظیم لیکن اس اعتقاد اور شعور کے ساتھ کہ معبود کو غائبانہ تصرف اور قدرت حاصل ہے۔ جس سے وہ نفع نقصان پر قادر ہے۔ کیونکہ معبود صرف وہی ہو سکتا ہے جس میں دو صفتیں موجود ہوں (۱) یہ کہ وہ عالم الغیب ہو کائنات کا ذرہ ذرہ اس پر منکشف ہو اور زمین و آسمان کی ساری مخلوق کے ظاہر و باطن، سر و علانیہ کو وہ اچھی طرح جانتا ہو (۲) یہ کہ وہ مالک و مختار متصرف فی الامور اور اقتدار اعلیٰ کا مالک ہو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں اپنے لئے استحقاق عبادت و پکار کا ذکر فرمایا ہے وہاں اپنی انہی دونوں صفتوں کو اس کی علت قرار دیا ہے اور جہاں کہیں غیر اللہ سے عبادت و پکار کی نفی کی ہے وہاں غیر سے دونوں صفتوں کی نفی فرمائی ہے کہیں دونوں صفتوں کی نفی ہے اور کہیں صرف ایک کی۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ سُبْحَانَ — اور تیرا رب جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اور پسند کرتا ہے ان لوگوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اللہ ان کے شرک
اللَّهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ — سے پاک ہے اور برتر ہے اور تیرا رب جانتا ہے جو ان کے دلوں میں پوشیدہ ہے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ اور
وَمَا يُعْلِنُونَ ۝ وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ — وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود بننے کے لائق نہیں۔ دنیا و آخرت میں تمام صفات کارسازی کا مستحق وہی
وَالْآخِرَةِ ۖ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (قصص ع ۷) — ہے۔ اور اسی کی حکومت ہوگی اور اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے۔

دوسری جگہ فرمایا لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرَىٰ ۝ وَإِن تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَى ۝ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ (طٰہٰ ع ۱) — اسی کی ملک میں ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں زمین میں ہیں اور جو چیزیں ان دونوں کے درمیان میں ہیں۔ اور جو چیزیں تحت الثریٰ میں ہیں اور اگر تم پکار کر بات کہو تو وہ تو چپکے سے کہی ہوئی بات کو اور اس سے زیادہ چھپی ہوئی بات کو بھی جانتا ہے۔ اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اس کے اچھے اچھے نام ہیں اور ایک جگہ ارشاد ہے۔ وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (هود ع ۱۰) اور آسمانوں اور زمین میں جتنی بھی غیب کی باتیں ہیں۔ ان سب کا علم صرف اللہ ہی کو ہے اور سب امور اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں پس تم اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ کرو اور تمہارا رب ان باتوں سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔ ان کے علاوہ آیۃ الکرسی اور دوسری کئی آیتوں میں بھی یہ مضمون وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

ان تمام آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی ان دونوں صفتوں کا ذکر فرمایا کہ وہ متصرف و مختار ہے۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اسی کے قبضہ میں ہے۔ زمین و آسمان کی ساری مخلوق کے تمام معاملات اور سارے کارخانۂ عالم کی تدبیر اور پورا نظام عالم اسی کے زیر اقتدار ہے۔ اور زمین و آسمان کے تمام غیوب کو جاننے والا بھی وہی ہے اور تینوں جگہوں میں دونوں صفتیں بیان کرنے کے بعد یہ اعلان فرمایا کہ جب عالم الغیب اور متصرف و مختار اللہ ہے تو معبود بننے اور پکارے جانے کے لائق بھی صرف اللہ ہی ہے، تمام صفات کارسازی بھی اسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو۔ اسی کو پکارو۔ اسی کے آگے جھکو اور اسی سے مانگو جو کچھ بھی مانگو۔ ایک مقام پر تو اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو خطاب کر کے صاف صاف ان کے رد پر انکار فرمایا کہ تم ایسے بے بس اور بے چارے معبودوں کو پکارتے ہو جو تمہارے نفع اور نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ تمہارے حالات کو جانتے اور نہ تمہاری پکار کو سنتے ہیں۔ اور اس خداوند دانا و علام کو چھوڑتے ہو جو سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ اور تمہارے نفع اور نقصان کا بھی پورا پورا اختیار رکھتا ہے۔ قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۚ وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (مائدہ ع ۱۰) کہہ دیجئے کیا تم خدا کے سوا ایسوں کی عبادت کرتے ہو ایسوں کو پکارتے ہو جو نہ تمہیں نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ نفع پہنچانے کا حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کچھ جاننے سننے والا ہے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ہر قول اور فعل، دعا اور پکار، ثنا اور تعظیم، رکوع اور سجود، قیام اور قعود وغیرہ۔ جو اس اعتقاد اور شعور کے ساتھ ہو کہ معبود کو مافوق الاسباب ہمارے تمام معاملات پر غیبی قبضہ اور تسلط حاصل ہے۔ اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے وہ عبادت ہے۔ چنانچہ علامہ ابن القیم نے عبادت کی تعریف کو ایک جامع تعبیر سے حسب ذیل عبارت میں بیان فرمایا ہے العبادة عبارة عن الاعتقاد والشعور بان للمعبود سلطة غيبية يقدر بها على النفع والضرر فكل ثناء ودعاء وتعظيم يصاحبه هذا الاعتقاد والشعور فهي عبادة (مدارج السالکین ص۲۴ ج ۱) یعنی عبادت اس اعتقاد اور شعور کا نام ہے کہ معبود کو ایک غیبی تسلط حاصل ہے۔ جس کی وجہ سے وہ نفع و نقصان پر قادر ہے۔ اس لیے ہر تعریف ہر پکار اور ہر تعظیم جو اس مذکورہ اعتقاد و شعور کے ساتھ ہو وہ عبادت ہے

ایک شبہ کا جواب تقریر بالا سے اس شبہ کا جواب بھی ہو گیا کہ تعظیم و تکریم اور عزت و احترام تو اللہ کے سوا اوروں کا بھی کیا جاتا ہے۔ خدا کے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم تو ساری امت پر فرض ہے استاد اور پیر و مرشد کا ادب و احترام بھی لازم ہے۔ اور والدین کی تعظیم و تکریم بھی ضروری اور لابدی امر ہے۔ لہٰذا اگر تعظیم و تکریم اور عجز کا نام عبادت

ہے تو پھر یہ بھی عبادت ہوگی۔ حالانکہ عبادت صرف اللہ کا حق ہے۔ غیر اللہ کی عبادت جائز نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ تعظیم صرف وہی عبادت ہے جس میں معبود کو مافوق الاسباب غیبی طور پر متصرف اور مختار اور عالم الغیب سمجھا جائے اور اگر معظم و محترم ہستی کو صفات بالا سے متصف نہ مانا جائے تو یہ تعظیم عبادت میں داخل نہیں۔ اس لیے ایسی تعظیم غیر اللہ کی بھی جائز ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تعظیم کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو ذات باری تعالےٰ کے ساتھ مخصوص ہے دوم وہ جو غیر خدا کے لئے بھی جائز ہے۔

تعظیم کی پہلی قسم

پہلے آیات قرآنیہ سے بوضاحت مذکور ہو چکا ہے کہ معبودیت کے لئے دو شرطیں ہیں ایک متصرف و مختار اور قدرت کاملہ کا مالک ہونا دوم زمین و آسمان کی تمام ظاہر اور چھپی ہوئی چیزوں کا عالم ہونا۔ علامہ ابن القیم کی جو عبارت پہلے نقل کی جا چکی ہے۔ اس کا حاصل بھی یہی ہے۔ کہ معبود وہی ہو سکتا ہے جسے علم اور تصرف کے اعتبار سے تمام مخلوق پر غیبی تسلّط حاصل ہو۔ جس کی وجہ سے وہ نفع اور نقصان پہنچانے پر قادر ہو۔ لہٰذا تعظیم کا ہر وہ طریقہ خواہ وہ حمد و ثنا ہو یا دعا و پکار، رکوع و سجود ہو یا کچھ اور جو اس اعتقاد اور شعور کے ساتھ بجا لایا جائے کہ معظم و محترم ہستی مافوق الاسباب اختیار و تصرف کی مالک اور عالم الغیب ہے تو ایسی تعظیم عبادت ہوگی اور ذات باری تعالےٰ کے ساتھ مخصوص ہوگی لہٰذا جب یہ عقیدہ ہو کہ فلاں کو مجھ پر ظاہری اسباب کے سوا مافوق الاسباب غیبی تسلّط حاصل ہے۔ اور وہ غائبانہ مجھے نفع و نقصان پہنچا سکتا ہے اس اعتقاد کے تحت کوئی بھی تعظیم ہاتھ پاؤں سے سرزد ہو یا زبان سے ثنا یا پکار ہو تو وہ اس کی عبادت ہوگی اگر یہ اعتقاد اللہ تعالےٰ کے متعلق ہو تو اس کے تحت کئے گئے تمام افعال تعظیم اللہ تعالےٰ کی عبادت میں داخل ہوں گے اور اگر معاذ اللہ مذکورہ بالا اعتقاد غیر خدا کے لیے ہو مثلاً فرشتہ، جن، پیغمبر، ولی زندہ یا فوت شدہ تو اس اعتقاد کے تحت سجدہ، رکوع، پکار، نذر و نیاز، جھکنا، دو زانو بیٹھنا، قبر پر چادر یا پھول چڑھانا وغیرہ تعظیمی افعال ان کی عبادت ہوگی اور شرک ہوگا۔ اللہ تعالےٰ نے جہاں کہیں خالص عبادت کا حکم دیا ہے اور شرک سے منع فرمایا ہے وہاں یہی مراد ہے کہ مذکورہ بالا اعتقاد و شعور کے ساتھ تمام تعظیمی افعال و اقوال (سجدہ، رکوع، دعا، پکار، نذر، نیاز وغیرہ) صرف اللہ تعالےٰ کے لیے بجا لائے جائیں سورہ زمر رکوع اول میں ارشاد ہے۔ فَاعۡبُدِ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ سو آپ خالص اعتقاد کر کے اللہ کی عبادت کرتے رہیے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ غیبی تسلّط اور مافوق الاسباب اقتدار اعلیٰ کے اعتقاد کے ساتھ ہر قسم کی تعظیم صرف اللہ ہی کی بجا لاؤ نہ کہ کسی پیغمبر یا ولی یا فرشتہ کی اور سورہ زمر کے دوسرے رکوع میں فرمایا۔ قُلۡ اِنِّىۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ اور ایک آیت کے بعد فرمایا قُلِ اللّٰهَ اَعۡبُدُ مُخۡلِصًا لَّهٗ دِيۡنِىۡ فَاعۡبُدُوۡا مَا شِئۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ۔ مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیں مجھے تو یہ حکم ملا ہے کہ میں غائبانہ تسلط اور مافوق الاسباب تصرف و قدرت کے تحت تمام تعظیمی افعال و اعمال صرف اللہ ہی کے لیے بجا لاؤں اور اے مشرکین تم مذکورہ اعتقاد کے ساتھ یہ تعظیمی افعال اللہ کے سوا جس کیلئے چاہو بجا لاؤ۔ ابراہیم و اسماعیل اور ہابیل (ہبل) علیہم السلام کے لئے یا لات اور دوسرے بزرگوں کے لیے لیکن میں تو ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ جو لوگ مذکورہ بالا تعظیم صرف اللہ کے لیے بجا لائیں گے اور غیر اللہ کی ایسی تعظیم سے اجتناب کریں گے جنت اور نعیم آخرت کی خوشخبری بھی ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے۔ وَالَّذِيۡنَ اجۡتَنَبُوا الطَّاغُوۡتَ اَنۡ يَّعۡبُدُوۡهَا وَاَنَابُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الۡبُشۡرٰى (زمر ع ۲)۔ یعنی جو لوگ طاغوت کی عبادت اور غیبی تسلّط کے اعتقاد کے تحت اس کے لئے تعظیمی افعال و اعمال بجا لانے سے اجتناب کریں اور یہ سب کچھ صرف اللہ ہی کے لیے بجا لائیں تو خوشخبری ایسے ہی لوگوں کے لئے۔ حاصل یہ ہے کہ غیبی تسلّط اور مافوق الاسباب تصرف و قدرت کے اعتقاد کے تحت جو افعال تعظیمی بجا لائے جائیں وہ عبادت میں داخل ہیں اور ایسی تعظیم اللہ کے ساتھ خاص ہے اور اللہ کے سوا کسی پیغمبر، ولی، پیر و مرشد، استاد اور ماں باپ اور حاکم وقت وغیرہ کے لئے جائز نہیں۔

تعظیم کی دوسری قسم

تعظیم کی دوسری قسم یہ ہے کہ غیبی تسلّط اور مافوق الاسباب قدرت و تصرف کا اعتقاد رکھے بغیر پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم، اپنے استاذ، پیر و مرشد اور دوسروں کی تعظیم و تکریم بجا لانا، ان کی اطاعت کرنا، ان کے سامنے دو زانو بیٹھنا، ان کے ہاتھوں کو بوسہ دینا، ان کی خدمت میں تحفے تحائف اور ہدیے پیش کرنا وغیرہ وغیرہ یہ تعظیم چونکہ عبادت میں داخل نہیں اس لئے یہ اللہ کے سوا قابل احترام ہستیوں کے لئے جائز ہے کیونکہ اس میں وہ اعتقاد نہیں پایا گیا جو عبادت کی روح ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ عبادت اور غیر عبادت میں فارق اور مابہ الامتیاز نیت اور اعتقاد ہے لیکن یہ بات یاد رہے کہ تعظیم کی بعض صورتیں ایسی ہیں جو اللہ تعالےٰ کے ساتھ مخصوص ہیں وہ کسی بھی نیت سے غیر اللہ کے لئے جائز نہیں ہیں مثلاً سجدہ کرنا۔ خدا کے گھر کا طواف کرنا حلف اٹھانا (قسم کھانا) اور نذر و منت دینا وغیرہ یہ امور ایسے ہیں کہ ہر حال میں اللہ ہی کے لئے کرنے جائز ہیں۔ غیر خدا کے لئے بالکل ناجائز ہیں۔ اگر یہ امور غیر خدا کے لئے مذکورہ بالا اعتقاد (غیبی تسلّط اور مافوق الاسباب قدرت) کے ساتھ کئے جائیں تو صریح شرک ہیں اور اگر اس اعتقاد کے بغیر کئے جائیں تو شرک نہیں ہوں گے لیکن اس صورت میں حرام ہوں گے۔ حاصل کلام یہ کہ تعظیم کے وہ افعال و اقوال جو خدا کے ساتھ مخصوص نہ ہوں اور ان کو مذکورہ بالا اعتقاد کے بغیر غیر خدا کے لیے بجا لایا جائے تو وہ عبادت میں شمار نہیں ہونگے اس لئے ایسی تعظیم غیر خدا کے لئے جائز ہے۔

استعانت

وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ۔ یہاں بھی مفعول کو فعل پر اس لئے مقدم کیا تاکہ حصر کا فائدہ حاصل ہو مطلب یہ کہ جس طرح عبادت صرف اللہ ہی کی ہونی چاہیئے اسی طرح استعانت (مدد طلب کرنا) بھی صرف اسی ہی سے ہونی چاہیئے۔ نہ کسی اور سے۔ استعانت یعنی حاجات و مشکلات میں پکارنا اور مدد مانگنا، چونکہ عبادت کی سب سے بڑی اور اہم شاخ ہے اس لئے عبادت کے بعد خصوصیت سے اس کا ذکر فرمایا، ہر آدمی جو کسی معبود کی عبادت کرتا ہے۔ دنیوی زندگی کے اعتبار سے اس کی عبادت کا مقصد اور لب لباب یہی ہوتا ہے۔ کہ اس کی تمام حاجتیں پوری ہو جائیں اور اس کی تمام مشکلیں آسان ہو جائیں۔ اسی لئے جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دعا (پکار) عبادت کا مغز اور لب لباب ہے۔ اَلدُّعَآءُ مُخُّ الۡعِبَادَةِ ——— اور ایک روایت میں ہے اَلدُّعَآءُ هُوَ الۡعِبَادَةُ (تفسیر ابن جریر ج ۲۴ ص ۴۶، ابوداؤد ج ۱ ص ۲۸، ترمذی ج ۱ ص ۱۷۳) یعنی پکار ہی اصل عبادت ہے قرآن مجید میں بھی لفظ عبادت بمعنی دعا اور پکار وارد ہوا ہے اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادۡعُوۡنِىۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَـكُمۡ‌ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِىۡ سَيَدۡخُلُوۡنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيۡنَ (مومن ع ۶) اور تمہارے پروردگار نے فرما دیا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا جو لوگ (صرف) میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب (مرتے ہی) ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ اس آیت میں پہلے اللہ تعالےٰ نے اپنی پکار کا حکم فرمایا ہے پھر پکار کو لفظ عبادت سے تعبیر فرمایا جیسا کہ خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ عبادتی سے مراد دعائی ہے یعنی اس آیت میں عبادت سے دعا اور پکار مراد ہے۔ (تفسیر ابن جریر ج ۲۴ ص ۷۸، و ابن کثیر ج ۴ ص ۸۵) سورۂ زمر اور حوامیم کا مرکزی مقصد ہے۔ فَادۡعُوا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَـهُ الدِّيۡنَ (مومن ع ۲) اور سورۂ فاتحہ میں اسی دعویٰ کو اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ سے بیان کیا گیا ہے اس طرح سارے قرآن کا مرکزی مضمون حوامیم میں اور حوامیم کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں اور فاتحہ کا لب لباب اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ میں ہے۔

ایک شبہ ہم ہر وقت یہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ ہر انسان دوسرے انسان سے مدد مانگتا ہے اور اسے اپنی مدد کے لیے پکارتا اور اس سے مدد کی درخواست کرتا ہے۔ یہ باہمی مدد و امداد کا سلسلہ اس قدر وسیع اور ضروری ہے کہ اس کے بغیر دنیا کا کاروبار ایک منٹ بھی نہیں چل سکتا اور اس باہمی امداد کا ثبوت خود قرآن مجید میں بھی موجود ہے حضرت عیسٰے علیہ السلام نے جب یہودیوں کی شرارت بھانپ لی اور سمجھ لیا کہ وہ کفر پر اڑ گئے ہیں تو اعلان کیا:۔

مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ (اٰلِ عمران ع ۵) اللہ کی طرف میرے مددگار کون ہیں تو حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے دین کے مددگار۔ اسی طرح حضرت ذوالقرنین نے بھی ایک قوم سے مدد کی درخواست کی تھی۔ سورۂ کہف رکوع ۱۱ میں ہے فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّۃٍ۔ یعنی تم لوگ قوت بازو سے میری مدد کرو۔ علاوہ ازیں اللہ تعالٰے نے تمام انسانوں کو امداد باہمی کا حکم دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی (مائدہ ع ۱) اور نیکی اور خدا خوفی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ غیر خدا سے مدد مانگنا جائز ہے آج کل کے اہل بدعت اس قسم کی چیزیں پیش کر کے عوام کو ورغلانے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو جی خدا نے ایک دوسرے سے مدد مانگنے کا حکم دیا ہے۔ اور حضرت عیسٰے علیہ السلام نے بھی اپنے متبعین سے مدد مانگی تھی۔ لہٰذا اولیاء اللہ سے بھی مدد مانگنا جائز ہے۔

اس کا جواب اہل بدعت کے قول سے معلوم ہوا العیاذ باللہ عوام الناس اولیاء اللہ اور انبیاء علیہم السلام کے حاجت روا اور مشکل کشا ہیں کیونکہ حضرت عیسٰے علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے مدد مانگی اور ذوالقرنین نے اپنی قوم سے۔ یہ اہل بدعت بھی عجب کشمکش اور مخمصے میں مبتلا ہیں ایک طرف تو دعوی کرتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام حاجت روا اور مشکلکشا ہیں اور دوسری طرف عوام الناس کو انبیاء اور اولیاء کا حاجت روا سمجھتے ہیں۔ معاذ اللہ ربی

یہ تو الزامی جواب تھا۔ اس کا تحقیقی جواب یہ ہے کہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں جو استعانت اور استمداد اللہ کے ساتھ مختص کی گئی ہے وہ اور ہے اور جو استمداد و استعانت روزمرہ کی زندگی میں ہر آدمی دوسرے سے کرتا ہے یا جو انبیاء علیہم السلام نے اپنے متبعین سے کی وہ اور ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

استعانت کی دو قسمیں استعانت (مدد مانگنے) کی دو قسمیں ہیں۔ ایک استعانت ماتحت الاسباب یعنی ظاہری اسباب کے تحت کسی سے مدد مانگی جائے۔ یہ وہ امداد ہے جو تمام انسانوں کو روزمرہ کی زندگی میں ایک دوسرے سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت عیسٰے علیہ السلام نے حواریوں سے جو مدد مانگی تھی وہ بھی ماتحت الاسباب تھی جب انہوں نے محسوس کیا کہ یہود ان کو قتل کرنا چاہتے ہیں تو حواریوں سے فرمایا کہ کیا تم میں کوئی ہے جو اللہ کے دین کے لیے میری امداد کرے۔ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے دین کے مددگار۔ یہ سارا معاملہ ماتحت الاسباب تھا حواری حضرت عیسٰے علیہ السلام کے پاس تھے۔ غائب نہیں تھے۔ انہوں نے بالمشافہ حواریوں سے اسباب عادیہ کے تحت امداد طلب کی اسی طرح ذوالقرنین نے بھی یاجوج ماجوج کو روکنے کے لئے دیوار بناتے وقت لوگوں سے جو کہا تھا۔ اَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّۃٍ۔ کہ تم لوگ قوت بازو یعنی کام سے میری مدد کرو یہ مدد بھی ظاہری اسباب کے تحت تھی۔ نہ حضرت عیسٰے علیہ السلام نے حواریوں کو غائبانہ پکارا اور نہ ان سے مافوق الاسباب مدد مانگی اور نہ ہی ذوالقرنین نے اپنی قوم سے ایسا کیا۔ جس طرح ظاہری اسباب کے تحت مدد امداد جائز ہے اسی طرح اسباب عادیہ کے تحت پکار بھی جائز ہے یعنی جو آدمی سامنے موجود ہو اسے پکار کر (یعنی اے فلاں کہکر) کوئی ایسا کام کرنے کا کہا جائے جو اسباب عادیہ کے تحت اس کی قدرت میں ہو مثلاً اسے کہا جائے کہ مجھے پانی پلادو یا بازار سے سودا سلف لادو وغیرہ۔ قرآن مجید میں ہے۔ جنگ احد میں وقتی افراتفری کی بنا پر جب کچھ صحابہ کرام حضور علیہ السلام سے علیحدہ ہو گئے تو آپ نے ان کو واپس بلایا۔ وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْٓ اُخْرٰىکُمْ (آل عمران ع ۱۶) اور رسول پیچھے سے تم کو بلا رہے تھے۔ حضور علیہ السلام کا یہ بلانا اور پکارنا اسباب ظاہری کے تحت تھا۔ اور آواز ان کو دی جا رہی تھی جو میدانِ احد میں آپ کی آواز سن رہے تھے۔ یہ پکار ماتحت الاسباب ہے اور اس کے بغیر دنیا کا کاروبار ہی نہیں چل سکتا۔ ایک جگہ فرمایا لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا (نور رکوع ۹) یعنی جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو نام سے اور بلند آواز سے پکارتے ہو اس طرح رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو نہ پکارا کرو۔ معلوم ہوا کہ جو استعانت، امداد باہمی اور پکار عادی اسباب کے تحت ہو وہ نہ صرف جائز ہے بلکہ اس کے سوا دنیا کا کاروبار ہی نہیں چل سکتا اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں اس قسم کی استعانت کا حصر مقصود نہیں اور نہ ہی اس کی قرآن میں ممانعت ہے۔

استعانت کی دوسری قسم ہے مافوق الاسباب یعنی اسباب عادیہ کے بغیر کسی کو دور و نزدیک سے غائبانہ پکارا جائے اور اس سے استمداد کی جائے یہ پکار اور استعانت اللہ تعالٰے کے ساتھ مخصوص ہے اور اللہ کے سوا کسی پیغمبر، فرشتہ یا ولی سے ہرگز جائز نہیں۔ تمام انسانوں بلکہ جانداروں کی مافوق الاسباب مدد اللہ تعالٰے ہی کرتا ہے۔ اس کی امداد میں قرب و بعد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ استمداد غیر خدا سے شرک ہے۔ اور یہی وہ استمداد و استعانت ہے جس کا اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں حصر ہے۔ اس موقع پر تفسیروں میں ایک سوال و جواب مذکور ہے کہ انسان ایک دوسرے سے کئی امور میں مدد لیتا ہے۔ پانی مانگتا ہے، روٹی مانگتا ہے۔ اور اس سے کئی ضرورت کی چیزیں طلب کرتا ہے۔ تو پھر اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا حصر کس طرح صحیح ہوا اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ انسان ظاہری اسباب کے تحت ایک دوسرے سے جو امداد لیتا ہے۔ وہ ظاہری امداد بھی دراصل اللہ تعالٰے ہی سے ہوتی ہے۔ کیونکہ مدد کرنے والے انسان کے جسم و جان کو خدا ہی نے پیدا فرمایا ہے اسے ہاتھ پاؤں اسی نے دیئے اور ان میں حرکت بھی اسی نے پیدا فرمائی لیکن استعانت اور استمداد کی مذکورہ بالا دو قسمیں (ماتحت الاسباب و مافوق الاسباب) بیان کرنے کے بعد اس قسم کے سوال و جواب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی

ایک مغالطہ بعض اہل بدعت اس موقع پر ایک اور مغالطہ پیش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ تو درست ہے کہ غیر اللہ کی عبادت جائز نہیں بلکہ شرک ہے۔ خواہ کسی پیغمبر کی عبادت ہو یا فرشتہ اور ولی کی۔ لیکن انبیاء اور اولیاء کو حاجات و مشکلات میں امداد کے لیے غائبانہ پکارنا شرک نہیں بلکہ جائز ہے اور قرآن مجید کی جن آیتوں میں غیر خدا کی دعا سے منع کیا گیا ہے وہاں دعا سے مراد عبادت ہے نہ کہ پکار اور ثبوت یہ پیش کرتے ہیں کہ مفسرین نے یَدْعُوْنَ کی تفسیر یَعْبُدُوْنَ سے یَدْعُوْا کی یَعْبُدُ اور اُدْعُوْا کی اُعْبُدُ سے کی ہے۔

جواب غیر خدا کو غائبانہ مافوق الاسباب پکارنا شرک ہے اور اہل بدعت کا استدلال سراسر غلط ہے کیونکہ پہلے بالتفصیل بیان ہو چکا ہے کہ دعا اور پکار کی دو قسمیں ہیں ایک مافوق الاسباب اور دوم ماتحت الاسباب۔ پکار کی پہلی قسم عبادت ہے اور اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ اور دوسری قسم چونکہ عبادت نہیں اس لیے وہ غیر اللہ کے لئے بھی جائز ہے۔ اور یہی وہ پکار ہے جس سے مغالطہ دیا جاتا ہے۔

باقی رہا مفسرین کا تَدْعُوْنَ کی تفسیر تَعْبُدُوْنَ سے کرنا تو اس سے ان کا مقصد دعا کا حاصل معنی بیان کرنا ہے۔ اور یہ مطلب ہے کہ غائبانہ مافوق الاسباب دعا بھی عبادت ہی کا فرد ہے (بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ دعا اور پکار عبادت کا سب سے اہم فرد ہے) اور جس طرح عبادت اللہ کے سوا کسی کی جائز نہیں اسی طرح یہ دعا اور پکار بھی اللہ کے سوا کسی کی جائز نہیں شاہ ولی اللہ الفوز الکبیر میں فرماتے ہیں "مفسرین حاصل معنی بطریق ابہام بیان می کنند مردمانِ ناواقف گمان می کنند کہ لفظی معنی کردہ اند۔ دعا بمعنی مطلق خواندن کسے را منع نیست۔ مراد از خواندن کسے را در غائبانہ حاجات است۔ لہذا مفسرین تفسیر بعبادت می کنند" شاہ صاحب کی عبارت سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کو پکارنا دو قسم ہے ایک غائبانہ حاجات میں یعنی مافوق الاسباب مفسرین کرام یَدْعُوْنَ کی یَعْبُدُوْنَ سے تفسیر کرکے اس طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔ کہ مافوق الاسباب غائبانہ حاجات میں پکارنا عبادت ہے اس لیے اللہ کے ساتھ مخصوص ہے اور غیر اللہ کے لئے شرک ہے۔ پکار کی دوسری قسم ماتحت الاسباب ہے اور وہ غیر اللہ کے لیے جائز ہے۔ جیسا کہ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ اور لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ میں ہے جیسا کہ تفصیل سے مذکور ہو چکا ہے۔ نیز تمام اہل لغت نے دعا کے معنی خواندن (پکارنا) سے کیے ہیں عبادت سے نہیں کیے اور مفسرین کا کام لغوی معنی بیان کرنا نہیں بلکہ ان کا کام تو مطلب اور تفسیر بیان کرنا ہے۔

۵ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ پہلی آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ سب کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور پھر ہر چیز اور ہر جاندار کو رفتہ رفتہ حد کمال تک پہنچانے والا بھی وہی ہے۔ سارے عالم کا نظام بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی متصرف و مختار ہے اور پھر محاسبۂ اعمال کے دن یعنی قیامت کے دن کا مالک بھی وہی ہے۔ جب انسان ان چاروں حقیقتوں کا اعتراف کرلے اور ان پر پختہ ایمان لے آئے تو وہ بلا ساختہ پکار اٹھے گا اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ یہ دراصل بندوں کا اپنے خدا سے عہد ہے کہ اے اللہ ہم صرف تیری ہی بندگی کریں گے صرف تجھے ہی حاجات و مشکلات میں مدد کے لیے پکاریں گے۔ اس کے بعد اهدنا الصراط المستقیم میں اسی عہد پر استقامت کی دعا مانگی جارہی ہے مطلب یہ ہے کہ اے اللہ یہ سیدھی راہ جو تو نے ہمیں دکھادی ہے یعنی توحید اور صرف تیری عبادت و پکار اور صرف تجھی سے استعانت و استمداد کی راہ اب ہمیں اس پر قائم رکھ اور تا دم آخرین ہمیں اس پر چلا۔ الصراط المستقیم کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس سے ایاك نعبد وایاك نستعین والا رستہ مراد ہے۔ اس صورت میں الصراط کا الف لام عہد خارجی کے لئے ہوگا۔ قرآن مجید کی دوسری کئی آیتوں میں صراط مستقیم سے توحید اور اللہ کی خالص عبادت و پکار کی طرف اشارہ ہے۔ ایک جگہ حضرت عیسے علیہ السلام کی زبان سے الصراط المستقیم کا یہ مفہوم بیان فرمایا۔ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (مریم ع ۲) اور بے شک اللہ ہی میرا پروردگار ہے اور وہی تمہارا پروردگار اس لیے صرف اسی کی عبادت کرو اور صرف اسے ہی پکارو یہی ہے صراط مستقیم (سیدھی راہ) اور ایک جگہ تمام بنی آدم کو خطاب کرکے فرمایا۔ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ (یٰس ع ۴) اے اولاد آدم کیا میں نے تمہیں اس بات کی تاکید نہیں کی تھی کہ شیطان کی بندگی مت کرنا اور صرف میری ہی بندگی کرنا یہی ہے صراط مستقیم۔

الصراط المستقیم کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس سے مطلق راہ حق مراد ہے جو اسلام کے تمام احکام کو شامل ہے۔ مثلاً عبادات، معاملات، اخلاق، معاشیات، سیاسیات، احکام برزخ، اصول آخرت وغیرہ۔ والمراد به طریق الحق وهو ملة الاسلام (مدارک جلد ۱ ص) سورۂ انعام رکوع ۱۹ میں بھی اس طرف اشارہ ہے۔ وہاں پہلے اللہ تعالیٰ نے شرک سے منع فرمایا پھر والدین سے احسان اور حسن سلوک کا حکم دیا۔ پھر قتل اولاد، قتل نفس محرم اور دیگر تمام فواحش سے منع کیا۔ پھر یتیموں کی حق تلفی سے روکا پھر ناپ تول پورا کرنے اور ہر حال میں عدل و انصاف کو قائم رکھنے کا حکم دیا اور آخر میں جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اعلان کرنے کا حکم فرمایا۔ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ۔ اور بے شک یہ ہے میرا راستہ جو بالکل سیدھا ہے۔ سو اس راہ پر چلو۔ یہاں دین کے تمام احکام کو صراط مستقیم فرمایا۔

الصراط المستقیم مرکب توصیفی ہے اور المستقیم اس چیز کو کہتے ہیں جو بالکل سیدھی ہو اور اس میں کسی قسم کی کجی اور پیچ وخم نہ ہو اور الصراط المستقیم (سیدھی راہ) توحید یا پوری ملت اسلام کو اس لئے فرمایا کہ توحید کی راہ بالکل سیدھی ہے جس پر چلنے سے انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ اگر راہ توحید سے سر مو ہٹ گیا تو سیدھا جہنم میں پہنچے گا۔ اسی طرح ملت اسلام بھی سیدھی اور درمیانی راہ ہے۔ اس میں نہ افراط ہے نہ تفریط جیسا کہ یہود نے حضرت عزیر کے بارے میں افراط اور حضرت مسیح علیہما السلام کے بارے میں تفریط سے کام لیا اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں افراط سے کام لیا اور حضرت خاتم نبوت صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں تفریط کی اسی طرح باقی احکام شرعیہ میں بھی پہلی امتوں میں افراط و تفریط تھی لیکن شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہر قسم کی اعتقادی اور عملی افراط و تفریط سے بالکل پاک ہے۔

لفظ ہدایۃ ہمیشہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ مفعول اول کی طرف ہمیشہ بلا واسطہ حرف جر اور مفعول ثانی کی طرف کبھی بواسطہ حرف جر مثلاً يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (یونس ع ۳) اور وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (انعام ع ۱۰)۔ اور کبھی بلا واسطہ حرف جر مثلاً وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (صافات ع ۴) اور وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (فتح رکوع ۱)۔ لیکن استعمال کی ان دونوں صورتوں کے معنوں میں فرق ہے۔ پہلی صورت میں ہدایۃ کے معنی ارائۃ الطریق۔ راہ نمودن یعنی راہ دکھلانے کے ہوں گے۔ اور دوسری صورت میں اس کے معنی ایصال الی المطلوب بمنزل رسانیدن یعنی منزل مقصود تک پہنچانے کے ہوں گے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں نَا ضمیر منصوب متکلم مفعول اول ہے اور الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ مفعول ثانی ہے جو بلا واسطہ حرف جر استعمال ہوا ہے۔ اس لئے ہدایت کے معنی یہاں ایصال الی المطلوب (منزل مقصود تک پہنچا دینے) کے ہیں۔ یہاں چونکہ منزل مقصود صراط مستقیم ہے اس لیے معنی یہ ہوں گے کہ ہم کو صراط مستقیم (سیدھی راہ) پر چلا اور اس پر قائم رکھ جیسا کہ حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے "چلا ہم کو راہ سیدھی" اور یہاں یہی معنی موزوں اور مناسب ہیں کیونکہ جب ایک شخص الحمد للہ سے ایاك نستعین تک بیان کردہ تمام باتوں پر ایمان لے آتا ہے اور ان پر عامل ہو جاتا ہے تو صراط مستقیم تو اس نے دیکھ لیا اور سیدھی راہ اسے مل چکی۔ اس لیے اب اهدنا الصراط المستقیم میں وہ سیدھی راہ دیکھنے کی دعا نہیں کر رہا بلکہ وہ یہ التجا کر رہا ہے کہ اے اللہ جو سیدھی راہ تو نے مجھے دکھادی ہے۔ اب اس پر مجھے قائم رکھ ومعناہ ادم هدایتنا (قرطبی ص ۱۴۸ ج ۱)

ہدایۃ کی دو قسمیں ہیں ایک فطری دوسری کسبی۔ فطری ہدایت تو انسان اور غیر انسان سب کے لئے عام ہے۔ اور اللہ کی طرف سے ہر ذی روح کو پیدائش کے ساتھ ہی عطا کی جاتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے وَاَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (طٰہٰ ع ۲)۔ اور اس نے ہر چیز کو صورت عطا کی اور پھر اس کی راہنمائی فرمائی اور ایک جگہ فرمایا۔ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى (الاعلیٰ) وہ جس نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کیا اور راہنمائی فرمائی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مرغی کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی دانہ چگنے لگتا ہے جانوروں کے بچے پیدا ہوتے ہی پستان مادر سے دودھ پینے لگتے ہیں

آخر انھیں کون بتاتا ہے کہ یہ ہماری غذا ہے اور اسے حاصل کرنے کا مقام اور طریقہ یہ ہے یہ راہنمائی اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور ہر ذی روح کی فطرت میں ودیعت ہوتی ہے۔

ہدایت کی دوسری قسم کسبی ہے جو اللہ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام اور کتب سماویہ کے ذریعے حاصل ہوتی ہے پھر اس کے چار درجے ہیں۔(۱) انابت یعنی اللہ کی طرف رجوع کرنا اور ضد وعناد کو چھوڑ کر راہ ہدایت کی تلاش و جستجو کرنا۔ ہدایت صرف انھی لوگوں کو ملتی ہے جن میں انابت الی اللہ اور تلاش حق کا جذبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ (رعد ع ۴) اور دوسری جگہ فرمایا۔ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ (شوریٰ ع ۱) یعنی اللہ تعالےٰ ہدایت کی توفیق صرف ان لوگوں کو دیتا ہے۔ جو اس کی طرف رجوع اور انابت کرتے ہیں۔

(۲) ہدایت۔ یعنی سیدھی راہ پانا یہ انابت اور رجوع الی اللہ کے بعد حاصل ہوتی ہے جیسا کہ پہلے مذکور ہوا۔

(۳) استقامت۔ ہدایت کے بعد استقامت کا درجہ ہے جب ایک آدمی کو ہدایت حاصل ہو جاتی ہے اور اسے صراط مستقیم مل جاتا ہے تو اب وہ اللہ کی ہدایت کے مطابق سیدھی راہ پر چلتا ہے اور اس پر قائم ہو جاتا ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا (حم سجدہ ع ۴) اس میں دوسرے اور تیسرے درجہ کا بیان ہے قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ میں ہدایت آگئی اور ثُمَّ اسْتَقَامُوا میں استقامت۔

(۴) ربط القلب۔ راہ ہدایت اور صراط مستقیم پر استقامت کے بعد ربط القلب کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ درجہ رسوخ ایمان اور یقین کی پختگی کا سب سے اونچا اور بلند مقام ہے۔ جب مومن کو ایمان و یقین کا یہ درجہ حاصل ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے راہ ہدایت سے نہیں ہٹا سکتی اور نہ اس کے ایمان و یقین کو متزلزل کر سکتی ہے یہ درجہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے اصحاب کہف کو یہ درجہ حاصل تھا چنانچہ ارشاد ہے إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا الآیۃ (کہف ع ۲) وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں ترقی کر دی اور ان کے دل مضبوط کر دیئے اس آیت میں تین درجات کا ذکر ہے۔ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ میں ہدایت فَزِدْنَاهُمْ هُدًى میں استقامت اور وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ ربط القلب کا ذکر ہے۔ ہدایت کا یہ درجہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی حاصل تھا جیسا کہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ (حجرات رکوع ۱) لیکن اللہ تعالےٰ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنا دیا اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا اور کفر اور فسق اور نافرمانی سے تم کو نفرت دے دی اهْدِنَا

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سَبْعُ آيَاتٍ

سورۂ فاتحہ مکی ہے اور اس میں سات آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱﴾ الرَّحْمَٰنِ

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا بیحد مہربان

الرَّحِيمِ ﴿۲﴾ مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ ﴿۳﴾ إِيَّاكَ

نہایت رحم والا ہے مالک روز جزا کا تیری ہی

نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴿۴﴾ اهْدِنَا

ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں چلا ہم کو

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِينَ

راہ سیدھی راہ ان لوگوں کی

أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ

جن پر تو نے فضل فرمایا جن پر نہ تیرا غصہ ہوا

وَلَا الضَّالِّينَ ﴿۶﴾ ع

اور نہ وہ گمراہ ہوئے

المنزل ۱

میں ہدایت کے آخری دو درجے حاصل کرنے کی درخواست کی گئی ہے یعنی استقامت اور ربط القلب۔ کیونکہ انابت اور ہدایت تو پہلے حاصل ہو چکی ہے۔ ہدایت کی طرح ضلالت کے بھی چار درجے ہیں۔ ان کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ ۹ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ سے بدل الکل ہے اور بدل کا فائدہ یہ ہے کہ صراط مستقیم کی تفسیر اور تعیین ہو جائے یعنی صراط مستقیم وہ راستہ ہے جس پر وہ لوگ قائم رہے جو الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے مصداق ہیں اور جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء، اور صالحین مراد ہیں جیسا کہ ایک دوسری آیت میں اس طرف اشارہ ہے۔ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ ——— (بقیہ برصفحہ)

موضح قرآن ف۱ جن پر تو نے فضل کیا ان سے چار فرقے مراد ہیں نبیین، صدیقین، شہدا اور صالحین۔ اور جن پر غصہ ہوا ان سے یہود اور گمراہوں سے نصاریٰ مراد ہیں۔ یہ سورۃ اللہ صاحب نے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ اس طرح کہا کریں۔

فتح الرحمٰن ف۱ مترجم گوید یعنی عالم انس و عالم جن و عالم ملائکہ و علیٰ ہذا القیاس واللہ اعلم ۱۲ ف۲ مترجم گوید مراد آنانکہ انعام کردہ شد بر آنہا چہار فرقہ اند۔ نبیین و صدیقین و شہداء و صالحین و آنہا کہ خشم گرفتہ شد بر آنہا یہود اند و گمراہان نصاریٰ۔ آمین قبول کن دعا و ما ۱۲

سُورَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ مِائَتَانِ وَسِتٌّ وَّثَمَانُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعُوْنَ رُكُوْعًا

سورۂ بقرہ مدنی ہے اور اس میں دو سو چھیاسی آیتیں اور چالیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى

لہ یہ کتاب بلاشبہ سراپا ہدایت ہے

لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ

ڈر والوں کے لئے تلہ جو کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا کلہ اور

يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

قائم رکھتے ہیں نماز کو شہ اور جو ہم نے دیا ان کو

يُنْفِقُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ

اس میں سے خرچ کرتے ہیں لہ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل

اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ

ہوا تیری طرف اور اس پر کہ جو نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کو

هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۙ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ

وہ یقینی جانتے ہیں شہ وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے پروردگار کی طرف سے

(الجزء ١)

(معانقة ١)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ سُورَةُ الْبَقَرَةِ لہ اس سورت کا نام مشہور تو یہی ہے "بَقَرَۃٌ" کے معنی گائے کے ہیں چونکہ اس سورت کے آٹھویں رکوع میں گائے سے متعلق ایک قصہ بیان ہوا ہے اس لئے اسی مناسبت سے اس کا نام سورۃ البقرہ (یعنی وہ سورت جس میں گائے کا ذکر ہے) رکھا گیا ۔

فضیلت : صحیح حدیثوں میں سورہ بقرہ کی بہت کچھ فضیلت ثابت ہے ۔ ایک حدیث میں حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے ۔ اِنَّ لِکُلِّ شَیْءٍ سَنَامًا وَاِنَّ سَنَامَ الْقُرْاٰنِ سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ (مستدرک ص۲۵۹ ج۱ جامع ترمذی ص۱۱۴ ج۲ وانظر تفسیر ابن کثیر ص۳۵ ج۱) یعنی ہر چیز کا ایک اعلیٰ حصہ ہوتا ہے اور قرآن مجید کا اعلیٰ و برتر حصہ سورۂ بقرہ ہے ۔ قرآن مجید کی سورتیں کلام اللہ ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں البتہ مضامین کے اعتبار سے بعض کو بعض پر فوقیت ہے ۔ سورۂ بقرہ میں چونکہ تمام بنیادی عقائد توحید رسالت کتب آخرت وغیرہ مرکزی اعمال (جہاد انفاق نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ) اور بعض اہم معاملات (نکاح طلاق عدت، قصاص، وصیت، رہن، قرض، سود وغیرہ) تفصیل سے مذکور ہیں بلکہ وہ تمام مضامین جو پورے قرآن میں پھیلے ہوئے ہیں وہ تفصیلاً یا اجمالاً سارے کے سارے اس سورت میں آگئے ہیں ۔ اسی مناسبت سے بعض روایتوں میں اس سورت کا نام فسطاط القرآن بھی آیا ہے ۔ فسطاط کے معنے خیمہ کے ہیں جس طرح خیمہ نیچے بیٹھنے والوں پر حاوی ہوتا ہے اسی طرح یہ سورت بھی قرآن مجید کے تمام مضامین پر حاوی ہے اس لئے اسے اس لحاظ سے باقی سورتوں پر فضیلت و برتری حاصل ہے ۔ ایک حدیث میں آپ کا ارشاد ہے اِقْرَءُوْا سُوْرَۃَ الْبَقَرَۃِ فَاِنَّ اَخْذَھَا بَرَکَۃٌ وَتَرْکَھَا حَسْرَۃٌ وَلَا یَسْتَطِیْعُھَا الْبَطَلَۃُ (صحیح مسلم ص۲۷۰ ج۱ ومسند احمد ص۵ ج۲) یعنی سورۂ بقرہ پڑھا کرو کیونکہ اس کا پڑھنا اور اس پر عمل کرنا باعث برکت اور اس کا ترک موجب حسرت و ندامت ہے مگر باطل پرست لوگ اس پر عمل نہیں کر سکیں گے ۔

ربط سورۂ بقرہ کو سورۂ فاتحہ کے ساتھ کئی طرح سے ربط ہے ۱۱ اور بطور اسمی ۔ یہ ربط حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص افادات میں سے ہے ۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے ۔ یہودی گائے کی پرستش اور اس کی تعظیم کیا کرتے تھے ۔ چنانچہ سامری نے جب سونے کا بچھڑا بنا کر ان کے سامنے لا رکھا تو سب اس کے سامنے جھک گئے اور اسے پوجنے لگے ۔ یہود کے علاوہ خود مشرکین عرب بھی گاؤ پرستی میں مبتلا اور اس کے تقدس کے قائل تھے ۔ جب کبھی بارش نہ ہوتی تو وہ گائے کی دم کے ساتھ گھاس پھونس باندھ کر اور اسے آگ لگا کر چھوڑ دیتے ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب آگ سے گائے کی دم جلے گی تو وہ چیخ و پکار کرے گی اور اس کی چیخ و پکار اور بے چینی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بارش برسائے گا ۔ چنانچہ زمانہ جاہلیت کا ایک سمجھدار اور سلیم الفطرت شاعر الورل الطائی ایسے ضعیف الاعتقاد مشرکوں کو ملامت کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

لا در در رجالٍ خاب سعیھم
یستمطرون لدی الازمات بالعُشَر

(ترجمہ) ان لوگوں کا بھلا نہ ہو جن کی کوشش ناکام ہوئی اور جو خشک سالی میں عُشَر (ایک پودا) کے ذریعہ بارش طلب کرتے ہیں (لسان العرب ص۱۳۰ ج۴)

اجاعل انت بیقورًا مسلعۃً
ذریعۃً لک بین اللہ والمطر

(ترجمہ) کیا تو اللہ اور بارش کے درمیان اس گائے کو وسیلہ بناتا ہے جس کی دم سے سَلَع (ایک پودا) کی ٹہنیاں بندھی ہوئی ہیں (مشکل القرآن ابن قتیبہ ص۳)

لہ تہبید میں تین جماعتوں کا ذکر علی سبیل لف و نشر مرتب ۱۲ پہلی جماعت منعم علیہم کا ذکر ہے

اور اس وقت کے عیسائی اس غلط راہ پر کہ بعض بزرگوں کی الوہیت کے قائل تھے اور انہیں الٰہی مختار سمجھ کر حاجات و مشکلات میں پکارتے تھے ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مریم صدیقہ کے متعلق عیسائیوں کے جو مشرکانہ عقائد تھے وہ قرآن مجید میں جا بجا تفصیل سے مذکور ہیں ۔ سورۂ بقرہ میں زیادہ تر روئے سخن یہود کی طرف اور سورۂ آل عمران میں نصاریٰ کی طرف ہے ان دونوں سورتوں میں زیادہ تر حقوق اللہ کے بعد حقوق العباد کا تذکرہ آیا ہے ۔ اس زمانہ میں جس طرح حقوق اللہ کو نہایت بیدردی سے پامال کیا جا رہا تھا ۔ اسی طرح حقوق العباد کو بھی نہایت بیدردی سے ضائع کیا جا رہا تھا خصوصاً عورتوں کے ساتھ نہایت وحشیانہ اور غیر منصفانہ سلوک کیا جا رہا تھا ۔ اور ان کی فطری کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کی خوب حق تلفی کی جاتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کے بعد سورۂ نساء میں عورتوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان سے حسن معاشرت کی تلقین فرمائی تاکہ مسلمان حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کریں اور اللہ کے خوان نعمت سے دنیا و عقبیٰ

موضح القرآن لہ یہ پہلی سورت ہے جو مدینے میں نازل ہوئی مگر ایک آیت وہ باتفاق حجۃ الوداع کے دن منا میں اتری اس سورت پہلی آیتوں کے نازل ہونے کا سبب مالک بن ضیف یہودی مرسون کے دل میں شک ڈالتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ کتاب وہ کتاب نہیں ہے جس کی خبر اگلی کتابوں میں دی گئی ہے اللہ تعالیٰ نے اس شک کو رفع کر کے مومنوں کی مدح اور کافروں کی مذمت میں آیتیں بھیجیں ۔

ہیں بہرہ مند ہوسکیں۔ اب ان سورتوں میں اسمی ربط بطریق ذیل ہوگا۔ اللّٰھم ایاک نعبد وایاک نستعین (فاتحہ) ولا نعبد ولا نستعین البقرۃ کما فعل الیھود والمشرکون (بقرۃ) ولا نعبد ولا نستعین آل عمران کما فعل النصاریٰ (آل عمران) ونؤدی حقوق النسآء رغبۃ ونؤتی صدقاتھن نحلۃ (نسآء) فانزل علینا مآئدۃ انعامک وافضالک فی الدنیا والاٰخرۃ (مآئدۃ)
اے اللہ ہم تیری بندگی کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ اور تیرے سوا کسی کی بندگی اور پرستش نہیں کرتے جس طرح یہود اور مشرکین عرب کرتے ہیں اور نصاریٰ آلِ عمران کے بزرگوں کی عبادت اور پرستش کرتے تھے۔ ہم عورتوں کے حقوق برضا و رغبت ادا کریں گے پس اے اللہ دنیا و آخرت میں اپنے فضل واحسان اور انعام واکرام سے سرفراز فرما۔

یہ اسمی ربط سورۂ مائدہ تک ہے۔ اس کے بعد کا اسمی ربط سورۂ انعام کے شروع میں مذکور ہوگا۔

دوسرا ربط سورۂ فاتحہ میں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ سے ہدایت کی درخواست کی گئی ہے اب سورۂ بقرہ کی ابتداء میں اس کی منظوری آگئی کہ یہ کتاب سرچشمۂ ہدایت ہے اور سیدھی راہ دکھاتی ہے اور پھر سورت میں ہدایت کا جامع اور مکمل پروگرام بیان فرمایا ہے۔

تیسرا ربط سورۂ فاتحہ میں تین جماعتوں کا ذکر تھا (۱) منعم علیہم جن پر اللہ کا انعام ہوا (۲) مغضوب علیہم جن پر اللہ کا غضب ہوا (۳) الضالین یعنی گمراہ لوگ۔ منعم علیہم سے مومنین مراد ہیں جن کے حالات آچکے ہیں۔ باقی دونوں گروہ غیر مومنین کے ہیں ان کے بھی حالات آچکے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بالتفصیل گذر چکا ہے۔ مغضوب علیہم سے وہ لوگ مراد ہیں جو فساد باطن کے ساتھ ساتھ فساد عمل میں بھی مبتلا ہیں یعنی نہ ان کے عقائد صحیح ہیں اور نہ اعمال درست ـــ یہ کافروں کا گروہ ہے اور الضالین سے مراد وہ لوگ ہیں جو صرف فساد باطن کا شکار ہیں اور ان کے عقائد میں کفر و شرک کی وہی گندگی موجود ہے۔ البتہ ان کے کچھ ظاہری اعمال مسلمانوں کے سے ہیں، یہ گروہ منافقوں کا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں ان تینوں جماعتوں کا ذکر اجمالی تھا اب سورۂ بقرہ کی ابتداء میں لف ونشر مرتب کے طور پر قدرے تفصیل سے ان کا ذکر کیا گیا اور ساتھ ہی ان کے کچھ اوصاف اور ان کی جزاء وسزا کا بیان بھی آگیا ہے۔ قال الامام الرازی ویحتمل ان یقال المغضوب علیھم ھم الکفار والضالون ھم المنافقون وذلک لانہ تعالیٰ بدأ بذکر المؤمنین والثناء علیھم فی خمس اٰیات من اول سورۃ البقرۃ ثم اتبعہ بذکر الکفار وھو قولہ ان الذین کفروا ثم اتبعہ بذکر المنافقین وھو قولہ ومن الناس من یقول اٰمنا فکذا ابدأ بذکر المؤمنین وھو قولہ انعمت علیھم ثم اتبعہ بذکر الکفار وھو قولہ غیر المغضوب علیھم ثم اتبعہ بذکر المنافقین وھو قولہ ولا الضالین (تفسیر کبیر ص۲۰۳ ج ۱)

چوتھا ربط سورۂ فاتحہ میں بندوں سے اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے ذریعہ اللہ کی توحید کا اقرار لیا گیا ہے اور عبادت واستعانت کے اللہ کے ساتھ مخصوص ہونے کا اعلان کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اسی دعوئ توحید کو مختلف مقاصد کے پیش نظر تین جگہ ذکر کر کے ہر جگہ اسے دلیل عقلی سے واضح اور ثابت کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے رکوع ۳ کی ابتداء میں یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ سے دعویٰ پیش کیا اور پھر اَلَّذِیْ خَلَقَكُمْ سے رِزْقًا لَّكُمْ تک دلیل عقلی پیش کی۔ دوسری دفعہ رکوع ۱۹ میں وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ سے دعویٰ پیش کیا اور اس کے بعد اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ سے یَعْقِلُوْنَ تک دلیل عقلی بیان کی۔ تیسری بار رکوع ۳۴ میں اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سے دعویٰ پیش کیا اور اس کے ساتھ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ سے الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ تک عقلی دلیل پیش کی۔ دعوئ توحید کو تین بار ذکر کرنے کا مقصد جدا گانہ ہے۔ پہلے موقع پر شرک فی الدعاء کی نفی مقصود ہے یعنی اللہ کے سوا غائبانہ دعاء اور پکار سننے والا اور کوئی نہیں۔ دوسرے مقام پر نذر ونیاز اور منت میں شرک کی نفی مقصود ہے۔ اور تیسری جگہ شفاعت قہری کی تردید مقصود ہے۔

خلاصۂ مضامین توحید، رسالت، جہاد فی سبیل اللہ، انفاق فی سبیل اللہ، امور انتظامیہ اور امور مصلحہ ـــــ سورۂ بقرہ مدینہ منورہ میں سب سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ مدینہ اور اس کے قرب وجوار میں یہودی کافی تعداد میں آباد تھے۔ اس لئے اس سورت میں یہود کی اصلاح کا پہلو بہت نمایاں ہے کیونکہ یہودیوں میں بڑے بڑے سرمایہ دار اور بڑے بڑے عالم اور پیر موجود تھے ان کی اصلاح سے پوری قوم کی اصلاح ہوسکتی تھی

تمام انبیائے سابقین علیہم السلام اور تمام کتب سابقہ کی تعلیم وتبلیغ کا ماحصل اور ان کی دعوت کا مرکزی نکتہ توحید باری تعالیٰ تھا۔ یعنی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معبود ومستعان، مالک ومختار، نافع وضار نذر ومنت کا مستحق اور حاکم وکارساز سمجھنا ـــــ سورۂ بقرہ کا مرکزی مضمون یہی دعوتِ توحید ہے۔ باقی تمام مضامین اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ اور اسی کے متممات اور لوازمات ہیں۔ اس سورت میں چار جگہ دعوئ توحید کو عقلی دلائل اور عالمگیر حقائق ومسلمات سے مدلل اور واضح کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے تیسرے رکوع کی ابتداء میں یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ سے تمام بنی آدم کو توحید کی عام دعوت دی گئی اس کے بعد الذی خلقکم الخ سے تسلیم شدہ حقائق اور روزمرہ کے مشاہدات کے ذریعے اس کی وضاحت کردی گئی۔ اس کے بعد انیسویں رکوع کے آخر میں وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ سے دعوتِ توحید کا اعادہ کیا گیا۔ اور ساتھ ہی اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں اسے آفاقی مشاہدات اور عقلی اور سائنٹیفک دلائل سے مدلل کیا گیا۔ آگے چل کر چونتیسویں رکوع میں اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ میں پھر دعوئ توحید کا اعادہ کیا گیا اور اس کے ساتھ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ تا اَلْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ سے عقلی دلیل بیان کردی گئی۔ ان تینوں جگہوں میں دعویٰ توحید اور دلیل عقلی دونوں ساتھ ساتھ مذکور ہیں۔ چوتھی جگہ یعنی سورت کے آخری رکوع میں لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ تا وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ میں دعوئ توحید پر دلیل عقلی پیش کر کے اسے اور زیادہ واضح اور مدلل کیا گیا ہے۔ دعوتِ توحید کے بار بار ذکر سے توحید کا ہر پہلو سے اثبات اور شرک کی ہر پہلو سے نفی مقصود تھی۔ یہود ونصاریٰ اور مشرکین عرب تین قسم کے شرک میں مبتلا تھے۔ (۱) وہ انبیاء علیہم السلام، ملائکہ کرام اور اولیاء اللہ کو عالم الغیب اور با اختیار سمجھ کر پکارتے اور حاجات ومشکلات میں ان سے استعانت کرتے تھے (۲) وہ اپنے مفروضہ معبودوں کو راضی رکھنے کے لئے ان کے نام کی نذریں، منتیں، نیازیں اور چڑھاوے دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے معبودوں کی یادگاریں قائم کی ہوئی تھیں اور ان کے نام کے استھان بنائے ہوئے تھے اور وہاں بصورت غلہ، نقدی یا جانور وغیرہ ان کے نام کے چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ اس طرح ہمارے معبود ہم سے خوش ہوجائیں گے اور ہمارے مال اور اولاد میں برکت دیں گے۔ یا اللہ سے برکت دلائیں گے۔ (۳) وہ اپنے معبودوں کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارشی بنا کر پیش کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بزرگان دین جن کی ہم عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کو اس قدر محبوب اور پیارے ہیں کہ اللہ ان کی بات رد نہیں کرتا اور وہ جو مطالبہ کریں اللہ کو ماننا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں دعوئ توحید کا تین دفعہ ذکر فرما کر شرک کی تینوں اقسام کی نفی فرمادی۔ پہلے موقع پر شرک فی الدعاء یعنی پکار اور دعاء میں شرک کی نفی کی، دوسرے موقع پر نذر ونیاز میں شرک کی۔ اور تیسرے موقع پر شفاعت قہری کی نفی فرمائی۔

مرکزی مضمون اور باقی ذیلی مضامین کے اعتبار سے اس سورت کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ ابتدائے سورت سے شروع ہو کر بائیسویں رکوع میں وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ پر ختم ہوتا ہے۔ اور دوسرا حصہ اسی رکوع میں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی سے لے کر سورت کے آخر تک چلا گیا ہے۔ پہلے حصے میں دو اعتقادی مسئلے بیان کئے گئے یعنی توحید اور رسالت اور دوسرے حصہ میں بھی دو ہی مسئلوں کا بیان ہے مگر ان کا تعلق عمل سے ہے یعنی جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ اور ساتھ ساتھ امور انتظامیہ اور امور مصلحہ کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ حصۂ اول میں ابتدائے سورت سے لیکر پندرھویں رکوع میں وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ تک توحید کا مضمون بیان ہوا ہے۔ شروع کے دو رکوعوں میں بطور تمہید تین جماعتوں کا تذکرہ ہے جو دعوئ توحید کو ماننے اور نہ ماننے سے پیدا ہوئیں۔ پھر یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ سے دعوئ توحید اور اَلَّذِیْ خَلَقَكُمْ تا وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ دلیل عقلی اور كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ تا اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ دلیل نقلی کا تتمہ بیان کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ نظام عالم کا مالک، مدبر اور کارساز اور ہر شئ جاننے والا

صرف اللہ ہی ہے اس لئے اپنی حاجات میں صرف اسے ہی پکارو۔ اس کے بعد توحید سے متعلق مشرکین کے دو شبہے ذکر کرکے ان کا جواب دیا ہے۔ مشرکین کا پہلا شبہ یہ تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کی پوجا اور پرستش اور انہیں پکارنے سے روکتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ مجھے اللہ نے ایسا ہی حکم دیا ہے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے بندوں کی پرستش سے منع کرے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا محمد جو کچھ کہتا ہے اپنی طرف سے کہتا ہے اور (عیاذاً باللہ) خدا پر افترا کرتا ہے جیسا کہ سورۂ یونس ع ۴ میں ہے اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ تو اللہ تعالیٰ نے وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ الخ سے اس کا جواب دیا مشرکین کا دوسرا شبہ یہ تھا کہ ہم کس طرح محمد کا دعویٰ مان لیں اور اس کلام کو کس طرح خدا کا کلام سمجھ لیں حالانکہ اس میں اللہ کے نیک بندوں کے پکارنے کو بالکل حقیر چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے جیسا کہ سورۂ عنکبوت ع ۴ میں ہے مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ج اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعویٰ اللہ کی طرف سے نہیں ہے اور نہ ہی یہ کلام اللہ کا کلام ہے تو اللہ تعالیٰ نے اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ الخ سے اس کا جواب دیا کہ مثال ممثل لہ کی وضاحت کیلئے ہوتی ہے اور مکڑی کی مثال سے مسئلۂ توحید کو واضح کیا گیا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ ان کے اعتراضات کی وجہ سے مثالیں بیان کرنا چھوڑ نہیں دیگا۔

مشرکین انبیاء و اولیاء کے علاوہ فرشتوں اور جنوں کو بھی پکارتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰۤؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ج بَلْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ج اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝ (سبا ع ۵) اس لئے اس کے بعد چوتھے رکوع میں وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ سے نوریوں، ناریوں اور خاکیوں کا ایک مسلم اصل آدم بیان کرکے ثابت کیا کہ فرشتوں کو تو آدم خاکی کی فطری خوبیوں کا پتہ بھی نہ چل سکا اس لئے نہ وہ عالم الغیب ہیں اور نہ حاضر و ناظر لہٰذا وہ حاجات میں پکارے جانے کے لائق نہیں اور ابلیس اور اس کی ذریت کو بنی آدم کے ساتھ شروع ہی سے عداوت و دشمنی ہے اس لئے وہ کس طرح تمہارے حمایتی اور پکارے جانے کے لائق ہو سکتے ہیں جیسا کہ سورۂ کہف ع ۷ میں ہے اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّیَّتَهٗۤ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام تو جنت ہی میں بھول گئے تھے اور معبود اس عیب سے پاک ہوتا ہے اس لئے وہ بھی دعا و پکار کے لائق نہیں ہیں۔

مدینہ منورہ اور اس کے گرد و نواح میں یہودی قوم آباد تھی۔ ان میں بڑے بڑے عالم، پیر اور نواب موجود تھے اس لئے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ میں دعوائے توحید کو عمومی طور پر بیان کرنے کے بعد پانچویں رکوع سے روئے سخن یہود کی طرف موڑ دیا ہے کہ اے عالمو، پیرو اور نوابو مسئلۂ توحید کو مان لو۔ اگر تم نے نہ مانا تو تمہاری وجہ سے تمہارے معتقدین اور تمہاری رعایا بھی نہیں مانے گی۔ اور ان کا وبال بھی تم پر پڑیگا۔ اس مسئلے کو ماننے سے اگر تمہیں دنیوی ریاست اور نذر و نیاز کی آمدنیاں چھوڑنی پڑیں تو صبر کرو اگر مان لوگے اللہ تعالیٰ تمہیں پہلے کی طرح اپنی نعمتوں سے نوازے گا۔ اور اگر نہ مانا تو عذاب میں مبتلا کئے جاؤ گے اس کو اُذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ تا وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ سے بیان فرمایا۔ پھر چھٹے رکوع سے گیارھویں رکوع کے آخر تک قوم یہود کی تذکیر و تفہیم کیلئے ان کے مختلف حالات و معاملات بیان کئے ہیں جن کی پانچ انواع ہیں۔ نوع اول میں وہ نعمتیں اور نقمتیں بیان کی گئی ہیں جو ان کے آباؤ اجداد پر ہوئیں تاکہ موجودہ بنی اسرائیل میں امید و خوف کا جذبہ پیدا ہو اور وہ دعویٰ توحید کو مان لیں۔ نوع ثانی میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کے آباء و اجداد خدا کی نافرمانی کیا کرتے تھے اور اس کے حکموں میں حجت بازی کرتے تھے۔ نوع ثالث میں بیان کیا گیا کہ موجودہ بنی اسرائیل بھی اپنے باپ دادا کی طرح خدا کے احکام کو ٹھکرا رہے ہیں اور اس کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ نوع رابع میں کہا گیا کہ موجودہ بنی اسرائیل کے آباء و اجداد نے صرف انبیاء علیہم السلام کی تکذیب پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ جب انہوں نے مسئلہ توحید بیان کیا تو یہ لوگ انہیں قتل کرنے سے بھی نہ چوکے۔ نوع خامس میں بیان کیا گیا ہے کہ گذشتہ بنی اسرائیل نے سابقہ انبیاء کی تکذیب کی اور انہیں قتل کیا لیکن موجودہ بنی اسرائیل آخری نبی کی تکذیب کر رہے ہیں اور اس کے لائے ہوئے دعویٰ توحید کو ٹھکرا رہے ہیں۔ اس کے بعد یہود کے ایک قول نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَیَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ کی پانچ طرح سے تردید کی گئی ہے اور آخر میں قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ اس تفصیلی وعظ و تذکیر سے بھی اگر یہودی ہدایت پر نہ آئیں اور مسئلہ توحید کو نہ مانیں اور اس ضد پر اڑے رہیں کہ جنت میں وہی جائیں گے اور کوئی نہیں جائیگا تو انہیں مباہلہ کا چیلنج دیا جائے کہ اگر وہ اپنے اس دعویٰ میں سچے ہیں تو میدانِ مباہلہ میں نکلیں۔ جب یہودی مباہلہ کیلئے تیار نہ ہوئے تب انہوں نے توحید پر شبہات وارد کرنے شروع کر دیئے اور غیر اللہ کی پکار کو جائز ثابت کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ پہلا شبہ ان کا یہ تھا کہ دعوائے توحید جو یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ میں مذکور ہے اس کا لانے والا جبرائیل فرشتہ ہے اور وہ اور میکائیل دونوں قدیم سے ہمارے دشمن ہیں اور ہمیشہ ہماری مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ دعوائے توحید بھی محض ہماری مخالفت کیلئے ہے اس لئے ہم اسے کبھی نہیں مانیں گے۔ دوسرا شبہ ان کا یہ تھا کہ ہمارے ورد وظیفے جو حضرت سلیمان علیہ السلام سے منقول ہو کر ہم تک پہنچے ہیں ان میں غیر اللہ کی پکار موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی غیر اللہ کو پکارا کرتے تھے اور اسی پر ان کی حکومت کا مدار تھا۔ ان کا تیسرا شبہ یہ تھا کہ ہاروت و ماروت دو فرشتے تھے جن کو اللہ نے جادو سکھانے کے لئے دنیا میں بھیجا تھا اور جادو میں غیر اللہ ہی کو پکارا جاتا ہے۔ تو جب خود اللہ نے غیر اللہ کی پکار کی تعلیم کیلئے فرشتوں کو بھیجا تو پھر یہ کیوں ناجائز ہے تو اللہ تعالیٰ نے رکوع ۲ میں قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ الخ سے شبۂ اولیٰ کا جواب اور لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ تا وَمَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا سے شبۂ ثانیہ کا جواب اور وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَیْنِ سے شبۂ ثالثہ کا جواب دیا۔

جب یہود کے شبہات کا تسلی بخش رد کر دیا گیا اور اب انہیں انکار و دعویٰ کی کوئی وجہ نظر نہ آئی تو اب انہوں نے یہ سازش کی کہ مسلمانوں میں مل جل کر رہیں اور خفیہ طور پر ان میں توہم شرک الفاظ داخل کریں تاکہ آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر مسلمان پھر سے شرک میں مبتلا ہو جائیں۔ چنانچہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہود کی اس سازش سے آگاہ فرمایا اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ پیغمبر علیہ السلام کو "رَاعِنَا" کہنا چھوڑ دیں کیونکہ یہ لفظ یہودیوں نے اپنی خفیہ سازش کے تحت مسلمانوں میں رائج کیا تھا تاکہ ان کے ذہن میں یہ تصور پیدا ہو جائے کہ خدا کا پیغمبر بھی نگہبان ہے اور اس طرح وہ پھر شرک کی دلدل میں پھنس جائیں کیونکہ رَاعِنَا راعاۃ سے ہے جس کے معنی نگہبانی کرنے کے ہیں اور رَاعِنَا کے معنی ہوں گے نگہبانی کر تو اللہ تعالیٰ نے اس کی جگہ اُنْظُرْنَا کہنے کا حکم دیدیا۔ آخر میں فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا سے یہ فرمایا کہ اہل کتاب ضد و عناد اور بغض و حسد میں اس حد تک آگے بڑھ چکے ہیں کہ وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ اس لئے جب تک اللہ کی طرف سے جہاد کا حکم نہیں آتا۔ اس وقت تک صبر و تحمل اور درگذر سے کام لو۔

اس کے بعد یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب کی پانچ معاندانہ باتوں کا شکوہ کرکے ان کا جواب دیا ہے۔ **پہلا شکوہ**۔ یہود و نصاریٰ کا دعویٰ تھا کہ ان کے سوا جنت میں کوئی نہیں جائیگا تو اللہ تعالیٰ نے قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ سے اس کا جواب دیا۔ **دوسرا شکوہ**: یہودی کہتے تھے عیسائیوں کا دین باطل ہے اور عیسائی کہتے یہودیوں کا دین باطل ہے كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ (ع ۱۳) سے اس کا جواب دیا۔ **تیسرا شکوہ** مشرکین اللہ کے گھر میں خدا کی توحید بیان کرنے اور خالص اسے ہی پکارنے سے منع کرتے تھے جیسا کہ مقام حدیبیہ میں مشرکین مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو بیت اللہ میں داخل ہونے سے روکا۔ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ الخ سے اس کا جواب دیا ہے۔ **چوتھا شکوہ**۔ یہودی کہتے حضرت عزیر خدا کا بیٹا اور اس کا نائب ہے، عیسائی حضرت عیسیٰ کو اور مشرکین فرشتوں کو خدا کی اولاد بناتے اور انہیں کارسازی میں اللہ کے نائب سمجھتے تھے۔ سُبْحٰنَهٗ ط بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ سے اس کا جواب دیا۔ **پانچواں شکوہ**۔ مشرکین کہتے تھے کہ اللہ ہم سے کیوں ہمکلام نہیں ہوتا۔ اگر وہ براہ راست ہم سے باتیں کرے تو ہم مان لیں گے كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے اس کا جواب دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر وقت یہ فکر رہتی تھی کہ مشرکین اور اہل کتاب ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ آپ کا فرض صرف یہ ہے کہ آپ ان تک دعوت توحید پہنچا دیں باقی منوانا آپ کا کام نہیں اور اگر آپ یہ چاہیں کہ یہود و نصاریٰ آپ سے خوش ہو جائیں تو وہ تو صرف اس شرط پر آپ سے خوش ہوں گے کہ آپ ان کا دین قبول کرلیں اور ان کی خواہشات کی پیروی کریں۔ اس کے بعد وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ میں بطور زجر فرمایا کہ اللہ کی طرف سے علم اور وحی آجانے کے بعد اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کرلی تو پھر آپ کو بھی خدا سے بچانے والا کوئی نہیں۔

ابتداء سورت میں دعویٰ توحید کو اَلَّذِیْ خَلَقَكُمْ سے عقلی دلیل لاکر ثابت کیا گیا تھا۔ اب یہود کے حالات بیان کرنے کے بعد اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ سے دعویٰ توحید پر نقلی دلیل پیش کی گئی ہے کہ یہود میں جو

علما ، ربانیین ہیں وہ اس دعویٰ کو مانتے ہیں ۔ اس کے بعد یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا (رکوع ۱۵) سے بنی اسرائیل کو دوبارہ یاد دہانی کراکر توحید کی بحث کو ختم کر دیا ہے ۔ آگے رسالت کی بحث ہے ۔

اس کے بعد پندرھویں رکوع میں وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ سے بائیسویں رکوع میں وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ تک رسالت کا بیان ہے پہلے بطور تمہید حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے جنہیں مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ اپنا روحانی و جسمانی باپ سمجھتے تھے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام جو بڑے پایہ کے پیغمبر تھے، جو ہر آزمائش میں پورے اترے اور جنہوں نے خانۂ کعبہ تعمیر کیا تھا ۔ انہوں نے ہی اللہ سے دعا مانگی تھی کہ اے اللہ مکہ میں ایک رسول بھیجنا ۔ اب وہ رسول آگیا ہے اور اس رسول نے کوئی نیا دعویٰ نہیں کیا بلکہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جو تمام پیغمبر کہتے چلے آئے ہیں اس کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں ۔ ہم صرف خدا ہی کی عبادت کرینگے اور صرف اسے ہی پکا رینگے ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہود و نصاریٰ کے تین غلط پروپیگنڈو کا جواب بھی دیا ہے ۔ پہلا پروپیگنڈہ ان کا یہ تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام وفات کے وقت وصیت کر گئے ہیں کہ وفات کے بعد ان کو پکارا کرنا تو اللہ تعالیٰ نے اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ سے اس کا رد فرمایا ۔ دوسرا پروپیگنڈہ وہ یہ کرتے تھے ۔ یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبر یہودی تھے اور عیسائی کہتے تھے کہ وہ عیسائی تھے اس لئے ان کا دعویٰ تھا کہ ہدایت صرف یہودیت اور نصرانیت ہی میں منحصر ہے ۔ اور اس طرح وہ لوگوں کو اپنے دین کی طرف بلاتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا اور قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ سے اس کا جواب دیا ۔ تیسرا پروپیگنڈا ان کا یہ تھا ہم انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہیں اس لئے ہم پر کچھ مواخذہ نہیں ہوگا ۔ اور ہم ان کے طفیل جنت میں چلے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ نے تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ سے تاکیداً دو دفعہ ان کے اس نظریے کی تردید فرمائی ۔

اس کے بعد مشرکین عرب اور یہود کی طرف سے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر دو شبہات وارد کئے جاتے تھے ان کا جواب دیا ہے ۔ پہلا شبہ یہ تھا کہ تمام انبیاء ع بنی اسرائیل کا قبلہ صدیوں سے بیت المقدس چلا آرہا ہے اور یہ پیغمبر ۱۶½ ماہ اسکی طرف منہ کرکے نمازیں پڑھتا رہا لیکن اب اس نے خانہ کعبہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنی شروع کر دی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ انبیاء بنی اسرائیل کا مخالف ہے یا اس پر اصل قبلہ مشتبہ ہوگیا ہے اور وہ حیران و سرگردان ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کے جواب میں تحویل قبلہ کی چار علتیں بیان فرمائی ہیں ۔ دو اجمالی اور دو تفصیلی ۔ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ الخ سے پہلی اجمالی علت بیان کی کہ تمام سمتیں اللہ کی ہیں وہ جس طرف چاہے منہ کرنے کا حکم دے ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے دوسری اجمالی علت بیان فرمائی کہ علماء یہود اور اہل کتاب خوب جانتے ہیں کہ آخری پیغمبر کا قبلہ خانہ کعبہ ہوگا اگرچہ اب کتمان حق کر رہے ہیں اور وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَآ سے پہلی تفصیلی علت بیان فرمائی کہ تحویل قبلہ سے مخلص اور غیر مخلص کا امتحان مقصود ہے اور لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ میں دوسری تفصیلی علت بیان فرمائی کہ تحویل قبلہ کا حکم تورات و انجیل میں مذکور ہے ۔ اگر تحویل کا حکم نہ آتا تو اہل کتاب کو ایک عذر ہاتھ آجاتا اس کے بعد مومنوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کا شکر بجا لائیں جس نے ان کو آخری اور ذو قبلتین (دو قبلوں والے) پیغمبر کی امت ہونے کا شرف بخشا ہے ۔ دوسرا شبہ ان کا یہ تھا بلکہ بعض نومسلموں کے دل میں بھی یہ خیال گذرا کہ صفا و مروہ پر تو آج تک بتوں کی پوجا ہوتی رہی ہے اب یہاں حج کے موقع پر اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے حالانکہ یہ جگہ اس قابل نہیں ہے تو اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ (رکوع ۱۹) سے اس کا جواب دیا کہ صفا و مروہ تو اللہ کے دین کی یادگاروں میں سے ہیں اور اب بتوں سے پاک ہو چکی ہیں اس لئے اب وہاں بے کھٹکے اللہ کی عبادت کرو ۔ دونوں شبہات کے درمیان یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ سے مسلمانوں کو صبر و استقلال کی تلقین فرمائی ۔ ممکن ہے کہ تحویل قبلہ کے بعد اہل کتاب و مشرکین سے مخالفت بڑھ جائے اور تمہیں ان کی طرف سے مالی و جانی نقصان برداشت کرنا پڑے اس لئے تم صبر کرنا اور ثابت قدم رہنا ۔ ازالہ شبہات کے بعد اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ سے وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ تک علمائے اہل کتاب کو زجر فرمایا جو حق کو چھپاتے تھے یا اس کا انکار کرتے تھے ۔ آگے وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سے اس دعویٰ توحید کا ذکر فرمایا جس کے کتمان و انکار پر اہل کتاب کو زجر کیا گیا پھر دعویٰ کو دلیل عقلی سے ثابت کرنے کے بعد وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ تک ان لوگوں کے لئے تخویف اخروی ہے جو دعویٰ توحید کو نہیں مانتے اور محبت و بندگی کا جو تعلق انہیں خدا سے رکھنا چاہیئے وہ ایسا تعلق غیر اللہ سے قائم کئے ہوئے ہیں اس کے بعد تمثیلاً اس تعلق کا مختصر بیان ہے جس میں دو چیزیں مذکور ہیں ۔ اول تحریمات عباد یا تحریمات غیر اللہ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا سے اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (رکوع ۲۱) تک اس کا بیان کہ یہ بحیرے اور سائبے وغیرہ جو تم نے اپنی طرف سے حرام کر رکھے ہیں، یہ حرام نہیں ہیں بلکہ حلال وطیب ہیں ۔ انہیں کھاؤ اور اپنی طرف سے کسی حلال چیز کو حرام مت ٹھہراؤ ۔ دوم نذر غیر اللہ اس کا ذکر اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ سے کیا کہ جو چیزیں غیر اللہ کی خوشنودی کیلئے ان کے نام پر بطور نذر و نیاز دیتے ہو یہ حرام ہیں اور اس کے ساتھ تین اور محرمات کا ذکر بھی فرمایا ۔ آگے اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ سے شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ تک ان لوگوں کے لئے زجر اور تخویف اخروی ہے جو حق بات بیان نہیں کرتے ۔ اور غیر اللہ کی نذر و منت اور دیگر باطل طریقوں سے لوگوں کا مال کھاتے ہیں ۔

تحویل قبلہ کے بعد یہود و نصاریٰ نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈہ تیز تر کر دیا اور ہر ایک نے نیکی اور عمل صالح کو اپنے ہی قبلے کی پیروی میں منحصر کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا سے اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ تک اس کا جواب دیا کہ اصل نیکی مخصوص سمتوں کی پابندی نہیں ہے بلکہ اصل نیکی تو خالص ایمان اور عمل صالح ہے ۔ جو شخص ایمان لائے ، شرک سے بچے اور نیک اعمال بجا لائے اصل میں نیک اور متقی تو وہ ہے یہاں تک حصہ اول ختم ہوا ۔ آگے حصہ دوم شروع ہوتا ہے جس میں جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ کا بیان ہے ۔ جہاد فی سبیل اللہ صرف وہی قوم کر سکتی ہے جو آپس میں منظم ہو اور جس کا اندرونی نظم و نسق درست ہو ۔ اس لئے جہاد کے ساتھ ساتھ امور انتظامیہ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے بارے میں اسلامی طرز عمل کی وضاحت کی گئی ہے اور امور انتظامیہ کے بارے میں اسلامی احکام کی پابندی صحیح طور پر صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ انسان کے باطن کی اصلاح ہو جائے اور اس کی طبیعت میں صلاح و تقویٰ کی خوبیاں پیدا ہو جائیں اس لئے امور انتظامیہ کے دوش بدوش امور مصلحہ کا ذکر کیا گیا ہے اور امور انتظامیہ کا ذکر تین جگہ آیا ہے ۔ پہلے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ سے حکم قصاص اور كُتِبَ عَلَیْكُمْ اِذَا حَضَرَ سے حکم وصیت اور پھر رکوع ۲۳ میں وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ سے ناحق مال غیر کھانے ، رشوت اور ناجائز مقدمہ بازی سے ممانعت فرمائی ۔ اس کے بعد آگے چل کر پھر امور انتظامیہ کا بیان فرمایا ۔ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً (رکوع ۲۸) سے قسم کے احکام اور لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ سے ایلا کے اور وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ سے لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (رکوع ۳۱) تک نکاح و طلاق ، عدت و رجعت ، رضاعت اور بیوی سے حسن معاشرت کے احکام بیان فرمائے ہیں ۔ اور پھر رکوع ۳۹ میں اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ سے ادھار پر خرید و فروخت ، باہمی لین دین اور شہادت وغیرہ کے احکام بیان فرمائے ہیں ۔ ان امور انتظامیہ کے درمیان تین امور مصلحہ بیان کئے گئے ہیں ۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ سے روزہ ، وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (رکوع ۲۴) سے حج اور حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ (رکوع ۳۱) سے نماز کا حکم دیا ہے ۔

تین امور انتظامیہ اور ایک امر مصلح کے بعد وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (رکوع ۲۴) سے جہاد کا حکم نازل فرمایا اور ساتھ ہی وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا ۔ کیونکہ انفاق کے بغیر کبھی جہاد نہیں ہو سکتا ۔ اس کے بعد وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُكَ (رکوع ۲۵) سے اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ (رکوع ۲۶) تک مختلف طریقوں سے جہاد کی ترغیب دی ہے ۔ اس کے بعد

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ سے انفاق کا بیان دہرایا ہے اور پھر کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ سے جہاد کا حکم دیا ہے اس کے بعد رکوع ۲۷ میں اشہر الحرم میں قتال کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیا ہے کہ ان عزت والے مہینوں میں قتال واقعی بڑا گناہ ہے لیکن لوگوں کو توحید سے اور مسجد حرام میں اللہ کی خالص عبادت سے روکنا اور کفر و شرک پھیلانا اس سے بھی بڑا گناہ ہے اس لئے بڑے گناہ اور فساد کو روکنے کے لئے ان مہینوں میں قتال جائز ہے چونکہ اشہر الحرم میں قتال کی دو جہتیں تھیں۔ ایک جواز کی اور ایک عدم جواز کی۔ اس لئے اسی مناسبت سے پانچ ذوجہتین مسائل اس کے بعد او ربیان فرمائے ہیں (۱) شراب اور جوا (۲) انفاق (۳) یتیم کا خرچ اپنے ساتھ رکھنا (۴) نکاح اہل شرک (۵) حائضہ بیوی سے مجامعت پھر اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا میں اسرائیلیوں کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جو موت سے بھاگے تھے لیکن پھر بھی موت سے نہ بچ سکے اس کے بعد قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے دوبارہ جہاد کا حکم دیا اور مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ سے انفاق کی ترغیب دی۔ اس کے بعد اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ سے ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ تک بھی جہاد کی ترغیب ہے۔ اس میں بیان کیا ہے کہ اللہ پر بھروسہ رکھنے والی اور اس کی توحید قائم کرنے والی چھوٹی سی جماعت بھی بڑی جماعت پر غالب آسکتی ہے اس کے بعد يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا سے انفاق کا حکم ہے اور پھر اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سے الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ تک دعوی توحید سے دلیل عقلی کو دہرایا ہے جس کی خاطر جہاد اور انفاق مشروع کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد دو قاعدے بیان فرمائے ہیں۔ **پہلا قاعدہ** ایمان والوں کے دلوں میں اگر شبہات پیدا ہو جائیں تو اللہ ان کے شبہات دور کر کے توحید کا راستہ ان کے لئے واضح کر دیتا ہے اس کا بیان اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (رکوع ۳۴) میں ہے۔ **دوسرا قاعدہ**۔ جو لوگ عناداً حق چھپائیں شیطان ان پر مسلط ہو جاتا ہے اور انہیں اس حد تک گمراہ کر دیتا ہے کہ ان کے دلوں پر مہر جباریت لگ جاتی ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا سے فِيْهَا خٰلِدُوْنَ تک اس کا ذکر ہے اس کے بعد ان دو قاعدوں پر لف و نشر غیر مرتب کے طور پر تین قصے متفرع فرمائے ہیں۔ نمرود کی سرکشی اور حضرت ابراہیمؑ سے اس کا مناظرہ۔ یہ دوسرے قاعدہ پر متفرع ہے اور اس کے بعد حضرت عزیرؑ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے دونوں واقعے پہلے قاعدہ پر متفرع ہیں۔ یہاں تک تو جہاد کا بیان زیادہ تھا۔ اور انفاق کا کم۔ اب آگے انفاق کے اکثر پہلوؤں کا تفصیلی بیان ہے۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ (رکوع ۳۶) سے وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (رکوع ۳۸) تک انفاق کا ذکر ہے۔ اس سلسلے میں مختلف طریقوں سے فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ خرچ کرنے میں ریاکاری اور دکھلاوے سے بچنے اور محض خدا کی رضا جوئی کیلئے خرچ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ صدقات و خیرات کے مستحق کون لوگ ہیں، خیرات کس طرح دینی چاہیئے، اللہ کی راہ میں کیسا مال خرچ کرنا چاہیئے، اور اس کے علاوہ بہت سے احکام متعلقہ انفاق بیان کئے گئے ہیں۔ اور ساتھ ہی سود کی حرمت اور سود خواروں کیلئے دنیوی و اخروی تخویفیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے بعد رکوع ۳۹ کی ابتدا میں لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ سے دعوی توحید کے اثبات میں چوتھی عقلی دلیل بیان فرمائی ہے جب پوری سورت میں دعوی توحید کو مختلف عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کر دیا گیا اور یہ واضح ہوگیا کہ اللہ کے سوا کوئی پکارے جانے کے لائق نہیں اور اللہ کے سوا کوئی نذر و نیاز اور منت کا مستحق نہیں اور نہ ہی اس کے مقابلہ میں کوئی شفیع غالب ہے تو آخر میں اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ سے اعلان کر دیا کہ خدا کا رسول اور تمام مومنین نظریۂ توحید کو کماحقہٗ مان چکے ہیں۔ لہٰذا اب انہیں صرف اللہ ہی کو پکارنا چاہیئے۔ اسی کے سامنے آہ و زاری کرنی چاہیئے اور اسی ہی سے اپنی امیدیں وابستہ کر کے دعا و التجا کرنی چاہیئے۔ اس لئے سورت کے اختتام پر اللہ سے دعا مانگنے اور اسے پکارنے کا طریقہ تعلیم کیا گیا ہے۔

مختصر خلاصہ

سورۂ بقرہ کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ اس کے دو حصے ہیں حصہ اول ابتدا ء سورت سے وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (رکوع ۲۲) تک ہے اور دوسرا حصہ وہاں سے سورت کے آخر تک۔ حصہ اول میں دو مضمون بیان کئے گئے ہیں۔ توحید اور رسالت۔ ابتدائے سورت سے وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (ع ۱۵) تک توحید اور وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ سے حصہ اول کے آخر تک رسالت کا بیان ہے۔ گویا کہ پہلا حصہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی تشریح ہے۔ دوسرے حصہ میں مسلمانوں کے ظاہر و باطن کی اصلاح کے طریقے، اور اندرونی نظام کو درست کرنے کے لئے امور انتظامیہ بیان فرما کر مشرکین کے مقابلہ میں انہیں جہاد اور انفاق کا حکم دیا گیا ہے گویا کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی خاطر مشرکین سے جہاد کا حکم فرمایا گیا ہے

سورت کی روح دینی اور دنیوی لحاظ سے منظم ہو کر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی خاطر مشرکین سے جہاد کرو۔

حصہ اول

(۱) تمہید (۲) توحید اور اس کے متعلقات (۳) رسالت اور اس کے متعلقات

تمہید ۔ تمہید میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اول یہ کہ جس ہدایت کی تمہیں طلب ہے وہ تمہیں کہاں سے ملے گی۔ دوم اس ہدایت کے رد و قبول کے اعتبار سے لوگوں کی مختلف جماعتوں کا ذکر۔ قدیم سے قدرت کا یہ قانون ہے کہ جب کوئی داعی حق دعوتِ دین پیش کرتا ہے تو لوگ دو حصوں میں بٹ جایا کرتے ہیں۔ کچھ ماننے والے اور کچھ نہ ماننے والے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ (نمل ع ۴) اس کے بعد اگر اہل حق کو دنیوی اقتدار بھی حاصل ہو جائے تو نہ ماننے والوں میں ایک خوشامدیوں کا گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو ظاہر میں دوست مگر باطن میں خطرناک دشمن ہوتا ہے۔ اسی طرح دعوتِ توحید کے آخری علمبردار حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم نے دین حق کی دعوت پیش کی تو حضرت ابوبکر صدیق، حضرت خدیجہ، حضرت علی، حضرت زیدؓ اور دوسرے جاں نثاروں نے آگے بڑھ کر آپ کی دعوت پر لبیک کہا۔ دوسری طرف ابولہب، ابوجہل، عتبہ، شیبہ اور ولید وغیرہ آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ پہلی جماعت آپ کی صداقت اور آپ کے لائے ہوئے دین کی حقانیت پر دل و جان سے ظاہراً و باطناً ایمان رکھتی تھی۔ یہ مومنین کی جماعت کہلائی۔ دوسری جماعت سراً و علانیۃً آپ کی نبوت اور صداقت کی منکر تھی یہ کفار کی جماعت کہلائی۔ ہجرت کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مادی قوت اور دنیوی اقتدار سے بھی سرفراز فرما دیا تو اب کافروں میں ایک اور گروہ پیدا ہوگیا۔ یہ لوگ مادی فوائد اور دنیوی معاملے کی خاطر دو رنگی چال چلنے لگے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے سامنے اسلام کا اظہار کرتے اور اسلام کے ظاہری احکام بجالاتے مگر باطن میں دوسرے کافروں کی طرح کفر و شرک اور انکار و عناد کی نجاستوں سے ملوث اور آلودہ تھے۔ یہ منافقین کا گروہ تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب مسلمانوں کی معیت میں کوئی دنیوی نفع دیکھتے تو ان کے ساتھ ہو لیتے اور ان سے کہتے ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو (سورہ فتح ع ۲) اور جب سمجھتے کہ ان کی سنگت موت اور ہلاکت کے مرادف ہے تو کہنے لگتے ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ کہ ہمیں پیچھے رہنے والوں کے ساتھ رہنے دو (سورہ توبہ ع ۱۱) اور لنگڑے بہانے بنانے لگتے اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ کہ جی ہمارے گھر اکیلے ہیں۔ (سورہ احزاب ع ۲)

اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں دعوت توحید پیش کرنے سے پہلے ان تینوں جماعتوں کا ذکر کر دیا ہے اور ساتھ ہی ان کے اوصاف اور ان کا انجام بھی بیان فرما دیا ہے تاکہ دعوت توحید کو قبول کرنے اور اسے رد کرنے کے نتائج و عواقب سامنے آجائیں اور انسان رد و قبول کے سلسلے میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے۔

امرِ اوّل

جس ہدایت کے تم طالب و متلاشی ہو وہ تمہیں خدا کی کتاب میں ملے گی ۔ الٓمّٓ یہ حروفِ مقطعات میں سے ہیں جو قرآن مجید کی انیس سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں، مفسرین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان حروف کے ان سورتوں کی ابتداء میں ذکر کرنے کی حکمتیں، ان کے ظاہری معانی اور ان کی تمثیلات بیان فرمائی ہیں۔ مفسرین کرام نے جو کچھ بیان کیا ہے اسے ان حروف مقطعات کے حقیقی معانی اور مرادات الٰہی تو نہیں کہا جا سکتا زیادہ سے زیادہ نہیں فوائد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ حروف بے معنیٰ اور مہمل نہیں ہیں ان سے مراد خداوندی متعین ضرور ہیں لیکن اس کا بھید اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ ہذا علم مستور وسر محجوب استأثر اللّٰہ تبارک وتعالیٰ بہ (تفسیر کبیر ص۲۲۷ ج۱، روح المعانی بمعناہ ص۱۰۲ ج ۳) خلفائے راشدین اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے یہی منقول ہے۔ اسی طرح عامر شعبی، سفیان ثوری، ربیع بن خثیم، ابن حبان اور ابوبکر انباری رحمہم اللہ تعالیٰ بھی اسی کے قائل ہیں (قرطبی ص۱۵۴ ج ۱، البحر المحیط ص۳۵ ج ۱، بیضاوی ص۷) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ لکل کتاب سر و سر القرآن اوائل السور (روح المعانی ص۱۰۲ ج ۱، تفسیر کبیر ص۲۲۷ ج ۱) یعنی ہر کتاب کا ایک بھید ہوتا ہے اور قرآن کا بھید سورتوں کے ابتدائی حصے یعنی حروف مقطعات ہیں۔ امام شعبی فرماتے ہیں۔ سر اللّٰہ تعالیٰ فلا تطلبوہ (روح المعانی ص۱۰۲ ج ۱، تفسیر کبیر ص۲۲۷ ج ۱) یعنی یہ حروفِ مقطعات اللہ تعالیٰ کا بھید ہیں ان کے پیچھے مت پڑو۔

سورتوں کی ابتداء میں ان حروف کے ذکر کرنے میں جو حکمتیں مفسرین کرام نے بیان کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اعمالِ شرعیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حکمت اور علت ہماری سمجھ میں آسکے، جیسے نماز، روزہ، اور زکوٰۃ۔ یہ بات بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ نماز میں قیام اور رکوع و سجود وغیرہ کے ذریعے اپنے مالک اور آقا کے سامنے انتہائی عاجزی اور بے چارگی کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ روزہ سے شہواتِ نفسانیہ کو کمزور کر کے روحانی پاکیزگی حاصل کی جاتی ہے۔ بھوک کے تجربہ سے غریبوں اور بھوکوں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور زکوٰۃ کے ذریعے ضرورت سے زائد دولت سوسائٹی کے معذور اور محتاج طبقہ میں تقسیم کر کے ان کی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم ان اعمال کی ہے جن کی حکمت اور علت ہماری سمجھ سے بالا تر ہے مگر ہم ایسے اعمال بجا لانے کے مکلف ہیں جیسا کہ افعالِ حج ہیں مثلاً صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا (دوڑنا) طواف میں رمل کرنا (کندھوں کو ہلا کر چلنا)، اور جمرات پر سنگریزے پھینکنا۔ کمالِ انقیاد اور تسلیم اسی کا نام ہے کہ احکم الحاکمین کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے خواہ اس کی علت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ بلکہ اطاعت کرنے کے لئے علت دریافت کرنا بے ادبی میں داخل ہے۔

اعمالِ شرعیہ کی طرح اقوال کی بھی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ ہیں جن کا مفہوم ہماری سمجھ میں آسکتا ہے۔ ایسے اقوال کے پڑھنے، ان کے معانی میں غور و فکر کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور کچھ اقوال ایسے ہیں جن کا مفہوم ہماری عقل و فہم سے ماوراء ہے مگر ہمیں ان کے حق ماننے اور پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے (تفسیر کبیر تفصیل ص۲۳ ج ۱) سورۂ آل عمران کی اس آیت کا یہی مطلب ہے۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (ترجمہ) وہ ایسا ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی جس کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو محکم ہیں (یعنی ان کا مطلب واضح اور ظاہر ہے) یہی آیتیں (اس) کتاب کا اصلی مدار ہیں۔ اور اس میں کچھ آیتیں ایسی ہیں جن کی مراد مشتبہ ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ دین میں شورش ڈھونڈنے اور اس کا مطلب تلاش کرنے کی غرض سے اسی کے پیچھے ہو لیتے ہیں جس کی مراد مشتبہ ہے حالانکہ اس کا مطلب بجز اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ جو لوگ علم (دین) میں پختہ کار ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر (اجمالاً) یقین رکھتے ہیں اور یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں۔ اور نصیحت صرف وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو اہل عقل ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہو گیا کہ قرآن مجید کی آیتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک "محکمات" یعنی وہ جن کا مطلب معلوم اور مراد متعین ہے۔ ان کا حکم یہ ہے کہ ان کے مطابق عمل کرنا واجب ہے۔ دوسری "متشابہات" یعنی وہ جن کی مراد مشتبہ ہے، اللہ کے سوا ان کی صحیح مراد کسی کو معلوم نہیں۔ علمائے ربانیین کا متشابہات کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہیں لیکن ان کا اصل مقصد خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ متشابہات کی دو قسمیں ہیں۔ قسم اول حروفِ مقطعات جو بعض سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں جیسے الٓمّٓ۔ الٓرٰ۔ الٓمّٓرٰ۔ طٰهٰ۔ حٰمٓ وغیرہ (ابن کثیر ص۳۶ ج ۱، روح المعانی ص۱۰۲ ج ۳، خازن ومعالم ص۲۳ ج ۱، ص۲۶۹ ج ۱، قرطبی ص۱۵۴ ج ۱)۔ اور قسم دوم وہ الفاظ ہیں جن کے ظاہری اور لغوی معانی تو معلوم ہوں لیکن ان کی اصل مراد سوا اللہ کے کسی کو معلوم نہ ہو جیسے اللہ کی طرف یَدٌ (ہاتھ) وَجْهٌ (چہرہ) وغیرہ کی اضافت جیسے اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (سورہ بقرہ رکوع ۱۴) اور یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (سورہ فتح رکوع ۱) ذٰلِكَ اس آیت کریمہ میں ترکیب نحوی کی کئی صورتیں ہیں۔ (۱) ذٰلِكَ الْكِتٰبُ مبتدا اور لَا رَیْبَ فِیْهِ جملہ اس کی خبر ہو۔ (۲) ذٰلِكَ مبتدا ہو اور الکتٰب اس کی پہلی خبر اور لَا رَیْبَ فِیْهِ خبر بعد خبر ہو یا علیحدہ جملہ ہو۔ اس صورت میں الْكِتٰبُ کا الف لام حقیقت کیلئے ہوگا۔ اور ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کا مطلب یہ ہوگا کہ کامل اور صحیح معنوں میں کتاب یہی (قرآن) ہے۔ (روح المعانی ص۱۰۶ ج ۱) یا الکتٰب کا الف لام عہد کیلئے ہوگا۔ اور اس سے اشارہ اس کتاب کی طرف ہوگا جس کے نزول کی بشارت تورات و انجیل کے ذریعے یہود و نصاریٰ کو مل چکی تھی اور وہ جانتے تھے کہ بنی اسماعیل میں آخری نبی پیدا ہوگا۔ اور اس پر اللہ کی طرف سے کتاب نازل ہوگی (روح المعانی ص۱۰۵ ج ۱) مگر اس صورت میں لَا رَیْبَ فِیْهِ کو علیحدہ جملہ قرار دینا زیادہ موزوں ہوگا۔ اور ترجمہ یوں ہوگا بے شک یہ وہی کتاب ہے یعنی جس کی بشارت انبیائے سابقین دے چکے ہیں۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ ای الكتٰب الذی اخبر الانبیاء المتقدمون بان اللّٰہ تعالیٰ سینزله علی النبی المبعوث من ولد اسماعیل (تفسیر کبیر ص۲۶۳ ج ۱)

ترکیب نمبر ۱ و ۲ میں هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ میں دو احتمال ہیں یا تو جملہ پہلے مبتدا کی خبر بعد خبر ہوگا یا علیحدہ جملہ ہوگا۔ اور اس کا مبتدا ھُوَ محذوف ہوگا۔ ان دونوں ترکیبوں کی صورت میں لَا رَیْبَ فِیْهِ کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کتاب کے اللہ کی طرف سے ہونے میں اور اس کے مضامین کی صحت اور واقعیت میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ یہاں نفس قرآن میں شک کی نفی مقصود ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اس میں کسی فرد بشر کو شک نہیں کیونکہ کسی آدمی کا قرآنی مضامین کی صحت یا اس کے من عند اللہ ہونے میں شک کرنا اس کے اپنے قصور فہم کا نتیجہ ہے۔ یہ ریب اس کے اپنے فہم میں ہے نہ کہ قرآن میں۔ اس لئے یہاں مقصود یہ ہے کہ یہ کتاب فی نفسہٖ ہر قسم کے شک و ریب سے پاک ہے۔ اس کے دلائل واضح اور براہین قاہرہ نے اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں چھوڑی (قرطبی ص۱۵۹ ج ۱، مدارک ص۸ ج ۱، کبیر ص۲۶۳ ج ۱)

(۳) ذٰلِكَ الْكِتٰبُ مبتدا، لَا رَیْبَ فِیْهِ جملہ معترضہ برائے تاکید هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ خبر۔ اس صورت میں آیت کا ترجمہ یوں ہوگا۔ بے شک یہ کتاب ڈر والوں کے لئے سراپا ہدایت ہے۔ اس ترکیب کی صورت میں ریب کے متعلق کوئی اشکال وارد ہوتا ہے اور نہ ہی کسی لفظ کو مقدر ماننے کی ضرورت ہے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اسی ترکیب کو ترجیح دیا کرتے تھے۔

یہاں ایک شبہ کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی کئی دوسری آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب (قرآن) بلا تخصیص تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (سورۂ بقرہ رکوع ۲۳) مگر اس آیت میں قرآن کے ہدایت ہونے کو متقی لوگوں کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ قرآن تا قیامت تمام بنی آدم کے لئے ہدایت ہے۔ مگر چونکہ اس کی ہدایت سے فائدہ صرف وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں خوفِ خدا ہو۔ اس لئے یہاں صرف متقین کا ہی ذکر کیا گیا ہے (تفسیر کبیر ص۲۶۶ جلد ۱، روح المعانی ص۱۱۱ جلد ۱) یا متقین سے مراد المنیبین الی اللّٰہ الذین یتقون العناد ویجتنبون العناد۔ یعنی جو لوگ اللہ کی طرف متوجہ اور راہِ حق کے طالب ہیں۔ جب وہ ضد و عناد کو بالائے طاق رکھ کر نظرِ انصاف سے اس کتاب کا مطالعہ کریں گے تو ان پر یہ کتاب یقیناً ہدایت کی راہیں کھول دے گی اور ان کے دلوں کو ضرور نورِ ہدایت سے

روشن و منور کردے گی۔ کما قال اللہ تعالیٰ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ (سورہ مومن رکوع ۲) وَيَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (شوریٰ ۲) مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ (سورہ ق رکوع ۳) وَيَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (رعد رکوع ۴) قال الشیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ

امر دوم

یعنی ہدایت کو قبول کرنے اور اس کو رد کرنے کے اعتبار سے لوگوں کی تین قسموں کا بیان

پہلی جماعت یعنی وہ لوگ جو ظاہر و باطن میں مسلمان ہیں۔ ان کی پانچ صفات بیان فرمائی ہیں **۱۵** متقین کی پہلی صفت یؤمنون ایمان سے ماخوذ ہے اور ایمان کے معنی دل سے ماننے اور تصدیق کرنے کے ہیں (قرطبی ص۱۶۲ ج ۱) اور غیب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو حس و عقل کی رسائی اور دسترس سے ماوراء ہو۔ ما لا یقع تحت الشعور ولا تقتضیہ بداھۃ العقل (روح المعانی ص۱۱۲ ج ۱) **وھو قول جمہور المفسرین** ان الغیب ھو الذی یکون غائبا عن الحاسۃ (تفسیر کبیر ص۲۵ ج ۱) اور یہاں **غیب** سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کا ادراک عقل و حس سے ناممکن ہے اور ان کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہے وہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع و اخبار ہی سے معلوم ہے۔ مثلاً ذات باری تعالیٰ، فرشتے، کتب سماویہ، انبیائے متقدمین علیہم السلام، احوال برزخ، علامات قیامت، حشر و نشر، صراط و میزان، جنت و دوزخ وغیرہ۔ کل ما اخبر بہ الرسول علیہ السلام مما لا تھتدی الیہ العقول من اشراط الساعۃ وعذاب القبر والحشر والنشر والصراط والمیزان والجنۃ والنار الخ (قرطبی ص۱۶۳ ج ۱) انہ ما اخبر بہ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فی حدیث جبریل علیہ السلام وھو اللہ تعالیٰ و ملائکتہ ورسلہ والیوم الآخر والقدر خیرہ وشرہ الخ (روح المعانی ص۱۱۲ ج ۱، ابن کثیر ص۴۲ ج ۱، قرطبی ص۱۶۳ ج ۱، ابن جریر ص۷۶ ج ۱) تو آیت کا ماحصل یہ ہوا کہ وہ لوگ ان تمام امور کو جو ان کی عقل و فہم اور حس و ادراک سے باہر ہیں، **محض پیغمبر علیہ السلام کی اطلاع پر** سچا مانتے اور ان کی تصدیق کرتے ہیں۔

یہاں ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ عالم غیب کی تمام اشیاء اور ان سے متعلق احوال و کوائف مثلاً عالم برزخ اور ما بعد الحشر کی تفصیلات و کوائف کو مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کے مطابق ہی مانا جائے گا ظن و تخمین اور عالم شہادت پر قیاس کے ذریعے عالم غیب کی کوئی چیز ثابت نہیں کی جا سکتی۔ عالم غیب کے امور جو نصوص قطعیہ سے ثابت ہیں مثلاً عذاب قبر، حشر و نشر وغیرہ ان کا انکار کفر اور جو امور دلائل ظنیہ سے ثابت ہیں مثلاً زندوں کے بعض اعمال سے مُردوں کا منتفع ہونا مثلاً ایصال ثواب) امت کے صلوٰۃ و سلام کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پہنچنا، اور عالم برزخ میں ارواح کا اجساد مثالیہ میں متمثل ہو کر عبادات اور دیگر افعال بجا لانا وغیرہ ان کا انکار بدعت ہے اور وہ امور جن کی بنیاد محض ضعیف اور بالکل کمزور روایتوں پر ہو ان کے انکار سے ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ ایسے امور کے رد و قبول میں قرآنی ارشادات اور صحیح روایتوں سے رہنمائی حاصل کی جائے گی۔ مُردوں کا سُننا، امت کے اعمال کا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے پیش ہونا وغیرہ ایسے ہی امور ہیں۔ ان امور کی پوری تحقیق اپنی اپنی جگہ آئے گی۔ **۵** متقی لوگوں کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ نماز قائم رکھتے ہیں۔ نماز قائم رکھنے سے اس کو اس کے تمام فرائض و واجبات، سنن و مستحبات اور حقوق و آداب کے ساتھ ادا کرنا مراد ہے۔ یاتون بہا بحقوقہا (تفسیر جلالین ص۴) عن ابن عباس اقامۃ الصلوٰۃ اتمام الرکوع والسجود والتلاوۃ والخشوع والاقبال علیہا فیہا وقال قتادۃ اقامۃ الصلوٰۃ المحافظۃ علی مواقیتہا ووضوءہا ورکوعہا وسجودہا (ابن کثیر ص۴۲ ج ۱) اقامتہا عبارۃ عن تعدیل ارکانہا وحفظہا من ان یقع خلل فی فرائضہا وسننہا وآدابہا، (تفسیر کبیر ص۲۵ ج ۱) ان عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز کی ایک ظاہری صورت ہے اور ایک باطنی حقیقت، ظاہری صورت تو یہ ہے کہ شرعی طریقہ کے مطابق نمازی کا بدن، اسکے کپڑے اور نماز پڑھنے کی جگہ پاک ہو۔ اور نماز کو اس کے تمام ظاہری ارکان و آداب کی شرعی حدود کی پابندی کرتے ہوئے ادا کیا جائے اور نماز کی باطنی صورت یہ ہے کہ نماز کو فریضۂ خداوندی سمجھ کر محض رضائے مولیٰ کی خاطر پورے خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کیا جائے اور نماز کے دوران نمازی کو اپنے دل کی توجہ کا مرکز بنایا جائے۔ خیالات فاسدہ اور وساوس شیطانیہ سے دل کو خالی اور پاک رکھا جائے۔ لہٰذا نماز کو ان تمام ظاہری اور باطنی حقوق کے ساتھ ادا کرنے کا نام اقامت صلوٰۃ ہے اور یہی متقین کی دوسری صفت ہے۔ اس صفت میں جس قدر کمال یا نقص ہوگا اسی قدر ان کے انوار میں فرق پڑ جائے گا۔ **۶** یہ متقین کی تیسری صفت ہے بعض مفسرین نے اس آیت سے "زکوٰۃ" مراد لی ہے مگر اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ آیت اپنے عموم پر ہی محمول ہے اور تمام حقوق مالیہ کی ادائیگی کو شامل ہے خواہ وہ واجب ہوں یا غیر واجب، مثلاً زکوٰۃ، نفلی صدقہ، قربانی، اپنی ذات اور اہل و عیال پر خرچ وغیرہ۔ والاولی لتاویلات بالآیۃ واحقہا بصفۃ القوم ان یکون کانوا لجمیع اللازم فی اموالھم مؤدین زکوٰۃ کان ذلک او نفقۃ من لزمتہ نفقتہ من اھل وعیال وغیرھم ممن تجب علیھم نفقتہ بالقرابۃ والملک وغیر ذلک (ابن جریر ص۸۰ ج ۱، ابن کثیر ص۴۳ ج ۱) ویدخل فیہ انفاق الواجب کالزکوٰۃ والنذر والانفاق علی النفس وعلی من تجب نفقتہ علیہ والانفاق فی الجہاد اذا وجب علیہ والانفاق فی المندوب وھو صدقۃ التطوع ومواساۃ الاخوان وھذہ کلہا مما یمدح بہا (خازن ص۲۶ ج ۱) بلکہ آیت اس سے بھی زیادہ عموم کی متحمل ہے۔ لفظ "ما" اپنے عموم اور وسعت کی وجہ سے ان تمام انعامات کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائے ہیں۔ خواہ مادی انعامات جیسے مال و اولاد، دولت و ثروت اور قوت و صحت وغیرہ۔ خواہ علمی جیسے علم و ہنر، عقل و حکمت اور فہم و فراست وغیرہ۔ لہٰذا اپنی قوت و صحت اور اولاد کے ذریعے دوسروں کی مدد کرنا، علم و حکمت سکھانا، مفید اور مخلصانہ مشوروں سے تعاون کرنا یہ سب اس آیت کے تحت داخل ہیں (الانفاق) البذل من النعم الظاھرۃ والباطنۃ وعلم لا یقال بہ ککنز لا ینفق منہ (روح المعانی ص۱۱۸ ج ۱) وقال بعض المتقدمین فی تاویل قولہ تعالیٰ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ای مما علمناھم یعلمون (قرطبی ص۱۷۹ ج ۱) **۷** یہ متقین کی چوتھی صفت ہے۔ اس آیت میں دو چیزوں کا ذکر ہے ایک وہ وحی جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ دوسری وہ وحی جو پہلے پیغمبروں پر اتری۔ پہلے انبیاء علیہم السلام کی کتابوں پر ایمان لانے سے مراد صرف یہ ہے کہ انہیں اللہ کی طرف سے مانا جائے اور انہیں سچا سمجھا جائے ان پر عمل کرنا واجب نہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اُسے حق اور من عند اللہ ماننے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل بھی کیا جائے اور اپنی زندگی اس کی ہدایت کے مطابق بسر کی جائے۔ آپ کی وحی صرف قرآن مجید ہی میں منحصر نہیں بلکہ آپ کے تمام دینی ارشادات جو کتب احادیث میں موجود ہیں یہ سب وحی تھے تو جس طرح قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح قرآن کے علاوہ دوسری وحی کو ماننا بھی فرض ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد وحی منقطع ہو چکی ہے اگر جاری ہوتی تو یہاں اس پر بھی ایمان لانے کا ذکر ضرور ہوتا۔ اس آیت میں جس ایمان کا ذکر ہے وہ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے الفاظ پورے عالم غیب پر حاوی تھے۔ مگر اس آیت میں عالم غیب کی صرف دو چیزوں کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے یعنی گذشتہ وحی اور موجودہ وحی پر ایمان لانا۔ تو اس تخصیص بعد التعمیم سے یہود و نصاریٰ میں سے جو لوگ ایمان لا چکے تھے ان کی عزت افزائی اور ان کی فضیلت کا اظہار مقصود ہے۔ (روح المعانی ص۱۲۰ ج ۱، تفسیر کبیر ص۲۵ ج ۱، تفسیر مظہری ص۲۳ ج ۱)

موجودہ وحی اور ایمان بالغیب کا

۸ یہ متقین کی پانچویں صفت ہے۔ یہاں آخرت سے مراد دار آخرت یعنی قیامت ہے نہ کہ نبوت جیسا کہ منکرین ختم نبوت کا خیال ہے۔ چنانچہ دوسری آیت میں ارشاد ہے وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ط (عنکبوت ع ۷) قیامت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ حشر و نشر، حساب و کتاب، جنت و دوزخ اور یوم قیامت کو جو کچھ ہونے والا ہے وہ سب کچھ مانتے اور اس کے وقوع پر یقین رکھتے ہیں۔

یہاں تک تو دعوت توحید کو قبول کرنے والوں اور کتاب ہدایت سے منتفع ہونے والوں کی صفات و علامات کا ذکر تھا۔ اب آگے ان صفات کا ثمرہ اور ان کے حاملین کی جزا کا بیان ہے۔

ف۵ دونوں جگہوں میں اولئک کا اشارہ مذکورہ بالاصفات کے حاملین کی طرف ہے۔ ای المتصفون بما تقدم من الایمان بالغیب واقام الصلوٰۃ والانفاق من الذی رزقہم اللہ (تفسیر ابن کثیر ص۴۴ ج ۱) ای الذین ھذہ صفتھم (تفسیر خازن ص۲۶ ج ۱) ای اھل ھذہ الصفۃ (معالم ص۲۶ ج ۱) یعنی جو لوگ مذکورہ صفات سے متصف ہیں دنیا میں وہ سیدھی راہ پر ہیں اور آخرت میں بھی انہیں خاطر خواہ کامیابی ہوگی۔ فان الھدٰی فی الدنیا والفلاح فی الاٰخرۃ (روح المعانی ص۱۲۵ ج ۱) اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مفلحون کا تعلق دنیا اور آخرت دونوں سے ہو (تفسیر ابن کثیر ص۴۴ ج ۱) یعنی سیدھی راہ پر چلنے اور کتاب ہدایت پر عمل کرنے کی وجہ سے وہ دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور آخرت میں بھی اُولٰئک ھم المفلحون ۔ میں ھُمۡ ضمیر فصل ہے جو حصر اور تخصیص کے معنیٰ پیدا کرتی ہے۔ (تفسیر بیضاوی ص۸ تفسیر مظہری ص۲۲ ج ۱) معتزلہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مرتکب کبیرہ مخلد فی النار ہے

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۵﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا

اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے ف۵ بے شک جو لوگ (ضد اور عناد سے) منکر ہوئے

سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ

برابر ہے ان کو ف۱۱ تو ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان

لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَعَلٰى

نہ لاویں گے ف (کیونکہ) مہر کر دی اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان

سَمۡعِهِمۡ وَعَلٰٓى اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمۡ

کے کانوں پر ف۱۲ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے

عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۷﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ

بڑا عذاب ہے اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ

ہم ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت پر اور وہ ہرگز

بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۸﴾ يُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَالَّذِيۡنَ

مومن نہیں دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے یعنی ایمان

اٰمَنُوۡا ۚ وَمَا يَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَ

والوں سے ف۱۳ اور درحقیقت کسی کو دغا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو [illegible] اور

مَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۹﴾ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ

نہیں سوچتے ف۱۴ ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھا دی

اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۙ بِمَا

اللہ نے ان کی بیماری اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے اس بات

كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ﴿۱۰﴾ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ

جھوٹ کہتے تھے ف۱۵ اور جب کہئے ان کو

ع ۱ — وقف لازم

اور اس کے لئے نجات نہیں کیونکہ اس آیت نے فلاح کو مذکورہ صفات والے مومنوں میں محصور کر دیا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ جن میں یہ صفات نہ ہوں وہ فلاح سے محروم رہیں گے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں حصر مطلق فلاح کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ فلاح کامل کے اعتبار سے ہے۔ یعنی فلاح کامل تو صرف انہی لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو مذکورہ صفات سے متصف ہوں گے۔ البتہ مطلق فلاح ان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ جن لوگوں میں بعض عملی خامیاں ہونگی نجات و فلاح تو آخر ان کو بھی حاصل ہو جائے گی وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۔ یدل علی انھم الکاملون فی الفلاح فیلزم ان یکون صاحب الکبیرۃ غیر کامل فی الفلاح (تفسیر کبیر ص۲۵ ج ۱) المراد المفلحون الکاملون فی الفلاح ویلزم منہ عدم کمال فلاح من لیس منھم لا عدم الفلاح مطلقاً (تفسیر مظہری ص۲۲ ج ۱، تفسیر بیضاوی ص۸) یہاں تک تو ان لوگوں کا ذکر تھا جنہوں نے کتاب ہدایت کو دل و جان سے مانا اور اسے اپنی زندگی کا دستور العمل بنایا۔ اب آگے دوسری جماعت کا ذکر ہے۔

دُوسری جماعت (کفار)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دعوت حق کو ظاہراً و باطناً ٹھکرا دیا، نہ دل سے مانا نہ زبان سے، بلکہ اپنی پوری طاقت سے اس کی مخالفت کی۔ ف۱۱ اس آیت میں کفروا سے مراد مطلق کافر مراد نہیں ہیں کیونکہ نبی کریم علیہ السلام کی تبلیغ پر ہزاروں کافر ایمان لائے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے بلکہ اس سے مراد خاص قسم کے کافر ہیں یعنی وہ لوگ جو حق کو اچھی طرح سمجھ چکے اور پہچان چکے ہوں مگر محض ضد اور عناد کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہوں۔ ضد و انکار کی وجہ سے ان کے ضمیر مردہ اور دل سیاہ ہو چکے ہیں اس لئے وعظ و نصیحت اور تبلیغ و انذار کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا ای ستروا الحق عناداً (مدارک) مشرکین مکہ میں ابوجہل، ابولہب، ولید بن مغیرہ وغیرہ اور یہود کے بعض علماء اور رؤساء مثلاً حی بن اخطب کعب بن اشرف وغیرہ اسی قسم کے کافر تھے۔ (ابو السعود ص۲۹۳ ج ۱

قرطبی ص۱۸۴ ج ۱ نیشاپوری ص۱۴۰ ج ۱) جیسا کہ فرعون اور اس کی قوم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَجَحَدُوۡا بِهَا وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا ؕ (نمل ع ۱) یہی حال مشرکین مکہ کا تھا۔ اور احبار یہود کے متعلق ارشاد ہے۔ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ (سورۂ بقرہ ع۱۱) اور ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ میں ہمزہ استفہام کے لئے نہیں ہے بلکہ تسویہ کے لئے ہے کیونکہ جو ہمزہ سواء، ما ادری، ما ابالی، لیت شعری وغیرہ کے بعد آئے وہ تسویہ کیلئے ہوتا ہے۔ اور علامت اس کی یہ ہے کہ مصدر اسکے مدخول کے قائم مقام ہوسکے (مغنی ابن ہشام ص۱۶ ج ۱) اور رضی شرح کافیہ ص۳۲۸ ج ۲) میں ہے ان الھمزۃ تستعمل مطرداً مع ام التسویۃ اور ام اس آیت میں احد الامرین کے لئے نہیں بلکہ یہ ام متصلہ ہے اور تسویہ کیلئے (رضی شرح کافیہ ص۳۱۷ ج ۲، مغنی ص۳۹ ج ۱) ترکیب نحوی۔ الذین کفروا موصول مع الصلۃ اسم انّ، سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ بتاویل المصدر، مبتدا مؤخر اور یہ جملہ خبر انّ ہے (تفسیر مظہری ص۲۳ ج ۱، رضی ص۳۱۷ ج ۲) لَا يُؤۡمِنُوۡنَ جملہ مفسرہ ہے جو ماقبل کی تفسیر کرتا ہے جملۃ مفسرۃ لاجمال ما قبلھا فیما فیہ الاستواء

(تفسیر مظہری ص۲۳ ج ۱، روح المعانی ص۱۲۹ ج ۱) یعنی ان کافروں کے حق میں آپؐ کے انذار اور عدم انذار کے یکساں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا اور وہ ایمان نہیں لائیں گے یا لَا یُؤْمِنُوْنَ جملہ اِنَّ کی خبر ہے۔ اور سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ الخ درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔ اوخبران والجملۃ قبلھا اعتراض (روح المعانی ص۱۳۰ ج ۱، تفسیر مظہری ص۲۳ ج ۱، مدارک ص۱۳ ج ۱) آیت کا مفہوم دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ ۱۱ یہ جملہ معللہ ہے اور ماقبل کی علت اور اس کا سبب بیان کر رہا ہے۔ اعلم انہ تعالٰی لما بین فی الاٰیۃ انھم لا یؤمنون اخبر فی ھٰذہ الاٰیۃ بالسبب الذی لاجلہ لم یؤمنوا وھو الختم (تفسیر کبیر ص۲۸۷ ج ۱) خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ استیناف تعلیلی لما سبق من الحکم (ابو السعود ص۲۸۸ ج ۱) اشارۃ الی برھان لمی للحکم السابق (روح المعانی ص۱۳۱ ج ۱) یعنی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے انذار کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے۔ کیونکہ ان کے دلوں اور کانوں پر مُہر لگ چکی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ چکا ہے۔ قبولِ حق کی تمام راہیں ان پر بند ہو چکی ہیں اس لئے اب وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور اس دولت سے ہمیشہ کے لئے محروم رہیں گے۔ اب یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالٰی ہی نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اور اس طرح ان پر قبولِ ہدایت کی تمام راہیں روک دیں تو پھر اگر وہ ایمان نہیں لائے اور کفر پر مر گئے تو انہیں سزا کس قصور پر دی جائے گی؟ کیونکہ مُہرِ خداوندی کی وجہ سے وہ کفر پر مرنے پر مجبور تھے۔ لہٰذا یہ بات عدل و انصاف کے منافی ہے کہ ایسے لوگوں کو سزا دی جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالٰی ظالم نہیں ہے، وہ کسی کو بلا قصور سزا نہیں دیتا اس آیت میں ان کافروں کا جو انجام بیان کیا گیا ہے وہ خود ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالٰی نے انسان کو پیدا کیا۔ دیکھنے سننے کیلئے اسے آنکھیں اور کان دیئے غور و فکر اور سوچ بچار کیلئے اسے دل و دماغ اور عقل و شعور کی دولت سے مالا مال فرمایا۔ ارشاد ہے۔ وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (سورہ نحل رکوع ۱۱) پھر آفاق و انفس کے واضح اور روشن دلائل کے دفتر اس کے سامنے کھول دیئے تاکہ وہ اپنے حواس کے ذریعے ان میں غور و فکر کر کے حق و باطل میں امتیاز کر سکے۔ سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ (حم السجدہ رکوع ۶) اور پھر اسی پر ہی بس نہیں کی بلکہ سیدھی راہ دکھانے اور عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ حق سمجھانے کے لئے پیغمبر بھی بھیجے جنہوں نے دن رات اللہ کا پیغام انہیں سنایا اور ان کے تمام شبہات دور کر کے اللہ کی حجت ان پر قائم کی رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (سورہ نساء رکوع ۲۳) لیکن اس کے باوجود کہ حق ان پر واضح ہو گیا۔ اور انہوں نے حق کو اچھی طرح پہچان لیا۔ انہوں نے حق کو نہ مانا بلکہ محض ضد و عناد کی وجہ سے کفر و انکار پر ڈٹے رہے۔ نہ آنکھوں سے کام لیا نہ کانوں سے — نہ عقل و شعور ہی کو استعمال کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ کفر و انکار ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر کے ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا۔ ان کے حواس بیکار ہو گئے اور حق کا احساس و شعور ہمیشہ کیلئے ان سے رخصت ہو گیا۔ اور ان پر گمراہی کی ایک ایسی تاریکی اور ظلمت چھا گئی کہ اب وہ اس سے باہر نہیں آ سکتے۔ گمراہی کی اس کیفیت کو مُہر سے تعبیر کیا گیا ہے تو یہ مُہر جو لگی ہے تو وہ قانونِ تکوینی کے تحت اپنے اسباب و علل کی بنا پر لگی ہے۔ جب کوئی شخص حق کو پہچاننے کے بعد محض ضد و عناد کی وجہ سے اپنے ارادے اور اختیار سے کفر کو ایمان پر ترجیح دیتا ہے تو اس سے ایمان کی توفیق چھین لی جاتی ہے اور اس کے حواس بیکار ہو جاتے ہیں اور وہ جدھر جانا چاہے اسے ادھر ہی کو دھکیل دیا جاتا ہے چنانچہ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے۔ فَمَآ اَغْنٰی عَنْھُمْ سَمْعُھُمْ وَلَآ اَبْصَارُھُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُھُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ کَانُوْا یَجْحَدُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ۔ (سورہ احقاف رکوع ۳) اور دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الْھُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِہٖ جَھَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا (سورہ نساء رکوع ۱۷)

اس سے معلوم ہوا کہ ان کے حواس پر مُہر کا لگنا، اور سعادتِ ایمان سے ان کی ابدی محرومی، یہ ان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہیں۔ ان کے جحود و انکار اور ضد و عناد کی وجہ سے ان کے دلوں پر مُہر لگی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس مُہر کی وجہ سے انہیں کفر پر مجبور کیا گیا ہے۔ حضرت شیخ رَوَّحَ اللّٰہُ رُوْحَہٗ اسے "مُہر جبّاریت" سے تعبیر فرمایا کرتے تھے۔ اور عارفِ رومی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

این نہ جبر معنیٔ جبّاریست   معنیٔ جبّاریت را زاری ست

اب یہاں ایک اور سوال باقی رہ جاتا ہے کہ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ میں مُہر لگانے کو اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مہر لگنا ان کے اعمال کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالٰی کا فعل ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک تمام افعالِ عباد کا خالق خدا تعالٰی ہے اور ہر کام کیلئے فاعل مباشر اور سبب کا ہونا ضروری ہے اور کام کو چونکہ تینوں سے نسبت ہوتی ہے۔ اللہ تعالٰی سے مخلوق ہونے کی نسبت، فاعل سے صدور کی اور سبب سے ترتّب کی۔ اس لئے فعل کو تینوں کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو قتل و غارت گری کے جرم میں پھانسی دے دی جاتی ہے تو اسے لوگ مختلف عبارتوں سے ہلائے زنی کریں گے۔ کوئی کہے گا "اللہ نے اس کا بیڑا غرق کر دیا"۔ کوئی کہے گا "اس نے خود ہی اپنا خانہ خراب کر دیا"۔ اور کوئی یوں گویا ہو گا کہ "بد اعمالیاں اسے لے ڈوبیں"۔ اپنی اپنی جگہ تینوں فقرے صحیح ہیں۔ جس نے اس مجرم کی تباہی کو خدا کی طرف منسوب کیا ہے اس کی ہرگز یہ غرض نہیں اور نہ ہی سامعین نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس کی تباہی کا ذمہ دار اللہ تعالٰی ہے اور وہ مجرم بری الذمہ اور بے قصور ہے بلکہ اس کی تباہی کو اللہ کی طرف اس لئے منسوب کیا گیا ہے کہ وہ خالق الافعال ہے۔ باقی رہی اس کی تباہی تو وہ اس کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح مہر لگانے کو مختلف نسبتوں کی وجہ سے مختلف ذوات کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ مُہر لگنے کا اصل سبب چونکہ ان کے اپنے اعمال تھے اس لئے کبھی اس کیفیت کو ان کے اعمال سے وابستہ کیا گیا۔ کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (تطفیف) اور کبھی ان معاندین نے اس مُہر کی سی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے سب کچھ اپنی ہی طرف منسوب کر لیا۔ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْہِ وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَیْنِنَا وَبَیْنِکَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ (حم السجدۃ رکوع ۱) اور اللہ تعالٰی چونکہ خالق الافعال، علۃ العلل اور مسبب الاسباب ہے اس لئے اس لحاظ سے مُہر لگانے کی نسبت اللہ تعالٰی کی طرف بھی کی گئی ہے جیسا کہ زیر بحث آیت میں ہے اس لئے مُہر لگانے کو اللہ کی طرف منسوب کرنے سے ایمان سے ان کی محرومی، کفر پر موت اور ابدی عذاب کی ذمہ داری اللہ پر عائد نہیں ہوتی یہ سب کچھ ان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے اور ان کا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔

یہاں تک کافروں کا ذکر تھا۔ اس کے بعد منافقوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔

تیسری جماعت (منافقین)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ظاہری طور پر اسلام تو قبول کر لیا مگر باطن میں کافر ہی رہے۔ ان لوگوں نے زبان سے تو اسلام کا اقرار کیا۔ مگر دل سے انکار کیا۔ ۱۲ اس آیت میں منافقین کے ایمان کی حقیقت بیان فرمائی کہ زبان سے تو وہ اللہ کی توحید اور آخرت کا اقرار کرتے ہیں لیکن ان کے دل یقین و ایمان اور تصدیق و اذعان سے یکسر خالی ہیں۔ اس کے بعد منافقت اور دورُخی چال سے ان منافقین کی غرض و غائت بیان کی گئی ہے۔ ۱۳ اس دورُخی چال سے وہ مسلمانوں کو فریب دے کر ان سے دنیوی اور مادّی فائدے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ ظاہری طور پر اسلام قبول کر لینے سے دنیوی احکام میں وہ مسلمان ہی شمار ہوں گے۔ ان کا جان و مال محفوظ ہو جائے گا اور مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً حاصل ہونے والے اموالِ غنیمت اور

بیگر بادی فوائد میں وہ ان کے ساتھ برابر کے شریک ہوں گے ۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ دھوکہ اور فریب تو اسے دیا جاسکتا ہے جو لاعلم ہو اور حقیقت سے ناواقف
ہو لیکن اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب والشہادہ ہے ۔ اور ہر ظاہر اور ہر چھپی چیز کو جانتا ہے ۔ اسے کیونکر دھوکہ دیا جاسکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے ای
یخٰدعون رسول اللّٰہ (تفسیر مدارک ص۱۵ ج ۱، قرطبی ص۱۹۵ ج ۱، مظہری ص۲۵ ج ۱، خازن ومعالم ص۲۸ ج ۱، کبیر ص۲۸۴ ج ۱، روح المعانی ص۱۴۶ ج ۱، نیشاپوری ص۱۵۳ ج ۱، البحر المحیط ص۵۶ ج ۱)
یعنی وہ اللہ کے رسول ﷺ کو دھوکہ دیتے ہیں (اس سے یہ بھی بخوبی ظاہر اور معلوم ہوگیا کہ ان تمام مفسرین اہل سنت وجماعت کا یہ متفقہ اور مسلمہ عقیدہ تھا کہ حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام
عالم الغیب نہ تھے نہ ذاتی طور پر نہ عطائی طور پر) یا اللہ کو دھوکہ دینے سے ایمان والوں کو دھوکہ دینا مراد ہے کیونکہ اللہ والوں کو دھوکہ دینا ادر وہ بھی صرف اس لئے کہ وہ مومن توحید کے پابند
ہیں ۔ ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ کو دھوکہ دینا ۔ وَ قیل المراد به المؤمنون واذا خادعوا المؤمنین فکانهم خادعوا اللّٰہ تعالیٰ (خازن ص۲۸ ج ۱) وقیل ذکر اللّٰہ ههنا تحسین والمقصود
بالمخادعة الذین اٰمنوا (معالم ص۲۸ ج ۱) اس صورت میں واؤ تفسیریہ ہوگی ۔ اور وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا عطف ماقبل پر تفسیری ہوگا ۔ ۱۴ منافق یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ وہ اپنی اس دورنگی پالیسی
سے مسلمانوں کو دھوکہ دیکر مزے کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ نہیں دے رہے بلکہ اپنی جانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اس منافقانہ روش سے غیر شعوری طور پر اپنی ہی عاقبت خراب
کر رہے ہیں ۔ ۱۵ مگر انہیں اس بات کا شعور واحساس تک نہیں ہے کہ ان کی یہ غلط روش خود انہی کی تباہی کا باعث ہوگی اور اس کا وبال خود انہی پر پڑے گا ۔ (قرطبی ص۱۹۷ ج ۱، معالم ص۲۸ ج ۱) اگلی
آیت میں منافقین کے حال پر مزید روشنی ڈالی ہے ۔ ۱۶ ان کے باطن کی خرابی اور فساد عقائد کو بیماری سے تعبیر فرمایا ۔ والمرض عبارة مستعارة للفساد الذی فی عقائدهم (قرطبی ص۱۹۷ ج ۱) اور یہ لفظ
نفاق شک وریب ، جحود وانکار پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے عداوت اور بغض وحسد وغیرہ سب کو شامل ہے ۔
فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ شَكٌّ وَنِفَاقٌ (معالم ص۲۸ ج ۱، ابن جریر ص۹۳ ج ۱) سنتعبر ههنا لما فی قلوبهم من الجهل وسوء العقیدة وعداوة النبی صلے اللہ علیہ وسلم وغیر ذلك من فنون الکفر (ابوالسعود ص۲۳۷)
ومجازا بان یستعار لبعض اعراض القلب کسوء الاعتقاد والغل والحسد والمیل الی المعاصی فان صدورهم کانت تغلی علی رسول اللّٰہ صلے اللہ علیہ وسلم غلاً وحنقاً (تفسیر نیشاپوری ص۱۵۴ ج ۱)
اور بیماری عضو کی اس غیر طبعی حالت کا نام ہے جس کی وجہ سے عضو کے طبعی افعال میں خلل وفتور واقع ہو جائے ۔ یہ تمام امور چونکہ دل کو خدا کی معرفت اور اس کی سچی اطاعت اور مخلصانہ عبادت سے روکتے ہیں اس لئے یہ سب روحانی
اور قلبی امراض ہیں ۔ (من الکبیر بتصرف) ۱۷ شک ونفاق اور بغض وحسد کی یہ بیماری جو ان کے دلوں کو لگی ہوئی تھی کم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتی گئی ۔ جوں جوں قرآن نازل ہوتا ان کا کفر ونفاق بڑھتا جاتا کیونکہ ہر آیت کے
ساتھ وہ منافقانہ سلوک کرتے ۔ بظاہر اسے مانتے لیکن دل میں اس کا انکار کرتے یا جوں جوں پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو دشمنوں پر غلبہ واقتدار حاصل ہوتا گیا اور دین اسلام کی شان وشوکت میں ترقی ہوتی گئی تو ان
کے دلوں کی جلن اور تکلیف اور ان کے سینوں میں بغض وحسد کی آگ بڑھتی گئی ۔ وزیادة اللّٰہ تعالیٰ مرضهم اما بتضعیف حسدهم بنعم اللّٰہ تعالیٰ علی رسوله صلی اللہ علیہ وسلم والمؤمنین او ظلمة قلوبهم بتجدد کفرهم
بما ینزله سبحانه شیئاً فشیئاً من الاٰیات والذکر الحکیم (روح ص۱۴۹ ج ۱) فَزَادَهُمُ اللّٰهُ میں فاء تعقیب کیلئے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فاء کا مابعد ماقبل پر مرتب ہے ۔ والفاء للدلالة علی ترتب مضمونها
علیه (ابوالسعود ص۳۰ ج ۱) یعنی ان کی بیماری انہیں کی بداعمالیوں اور بدپرہیزیوں کا نتیجہ ہے ۔ باقی رہا اضافہ مرض کو خدا کی طرف منسوب کرنا تو وہ محض اس لئے ہے کہ وہ مسبب الاسباب ہے اور فاعل حقیقی ہے ۔
آیت کے ان دونوں حصوں میں منافقین کے انجام کی علت اور سبب کا بیان تھا آگے ان کے انجام کا ذکر ہے ۔ ۱۸ منافقین خبث باطن اور فساد عقیدہ کی خطرناک بیماری میں مبتلا تھے ۔ خدا کی طرف سے آیات
شفا لگاتار نازل ہوتی رہیں ۔ مگر انہوں نے ان سے اعراض کیا اور ان سے فائدہ اٹھانے کی ادنیٰ سی کوشش نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا مرض بڑھتا گیا اور آخر ان کی ہلاکت کا باعث ہوا اور وہ دائمی عذاب
اور دردناک سزا کے مستحق قرار پائے ۔ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ میں یہاں بسببیت کے لئے (اور مَا مصدریہ ہے ۔ (روح ص۱۵۱ ج ۱، ابوالسعود ص۳۰ ج ۱) اور فعل ناقص دوام واستمرار کیلئے ہے (ابوالسعود، روح ص۱۵۲ ج ۱) یعنی
مسلسل کذب بیانی اور نفاق پر لگاتار اصرار کی وجہ سے انہیں مذکورہ سزا کا حکم سنایا گیا ہے اور یہاں جھوٹ بولنے سے وہی نفاق مراد ہے یعنی دل میں اسلام کا انکار چھپائے ہوئے ہیں مگر زبان سے اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ
بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ کا اقرار کرتے ہیں ومعناه بکذبهم وقولهم اٰمنا ولیسوا بمؤمنین (قرطبی ص۱۹۸ ج ۱) ای بکذبهم فی قولهم اٰمنا باللّٰہ وبالیوم الاٰخر (مدارک ص۱۶ ج ۱)
آگے منافقین کی مزید خباثتیں ذکر کرکے ان کے حال کو اور واضح کیا گیا ہے ۔ ۱۹ منافقین بظاہر مسلمان تھے لیکن درپردہ کافروں سے ربط قائم کر رکھا تھا مسلمانوں کے
پوشیدہ راز ان تک پہنچاتے اور انہیں مسلمانوں کے خلاف اکساتے رہتے اور اس طرح فتنہ وفساد کیلئے زمین ہموار کر رہے تھے ۔ وکان فساد المنافقین فی الارض انهم کانوا یمایلون الکفار ویمالئونهم
علی المسلمین بافشاء اسرارهم الیهم واغرائهم علیهم وذلك مما یؤدی الی هیج الفتن بینهم (مدارك ص۱۶ ج ۱) والفساد منها النفاق الذی صافوا به الکفار فاطلعوهم
علی اسرار المؤمنین فان کل ذلك یؤدی الی خراب الارض وقلة الخیر ونزع البرکة وتعطل المنافع (روح ص۱۵۳ ج ۱) ۲۰ یعنی ہم نے تو مسلمانوں اور کافروں دونوں فریقوں سے
میل جول قائم کر رکھا ہے اس سے ہمارا مقصود صرف دونوں فریقوں میں صلح وآشتی کی فضا پیدا کرنا ہے اور کچھ نہیں ان هذه المداراة سعی فی الاصلاح بین المسلمین والکفار (کبیر ص۲۸۸ ج ۱)
قالوا انما نرید الاصلاح بین المؤمنین واهل الکتاب (ابن جریر ص۹۷ ج ۱) ۲۱ یہ منافقوں کے دعوے کا نہایت ہی بلیغ طریقہ سے رد ہے ۔ جملہ مستانفہ لاکر اور حرف تنبیہ سے سامعین کو متوجہ
کرکے حرف تاکید اور کلمۂ حصر سے اس حقیقت کو واضح فرمایا کہ یہ لوگ مصلح ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں حالانکہ فتنہ وفساد کا سرچشمہ یہی لوگ ہیں اور زیادہ تر فساد انہیں کے ذریعے پھیل رہا ہے ۔
۲۲ ان کے دل مرض نفاق کی وجہ سے اس حد تک مردہ اور بے حس ہوچکے تھے کہ اصلاح وفساد میں امتیاز نہیں کرپاتے اور شر وفساد کو امن وصلاح قرار دے رہے ہیں ۔ وهذا انما نشأ عن
جهل مرکب فاعتقدوا الفساد صلاحاً واصروا واستکبروا واستکباراً (روح ص۱۵۲ ج ۱) ۲۳ یہ منافقین کی دوسری خباثت ہے ۔ زبان سے آمنا کہہ کر مومن ہونے کا دعویٰ تو وہ پہلے ہی کر
چکے تھے ۔ یہاں دوبارہ انہیں ایمان لانے کا حکم دیا جارہا ہے ۔ وہ منافقانہ طور پر ایمان لائے ہوئے تھے اب انہیں مخلصانہ طور پر ایمان لانے کا حکم دیا جارہا ہے ۔ ای ایمانا مقرونا بالاخلاص
بعیدا عن النفاق (کبیر ص۲۸۹ ج ۱) مقرونا بالاخلاص خالصا عن شوائب النفاق (روح ص۱۵۵ ج ۱) اور النَّاس میں الف لام عہد کا ہے اور اس سے مراد مہاجرین وانصار ہیں یا وہ مومنین
مراد ہیں جو اہل کتاب میں سے ایمان لاچکے تھے ۔ عبداللہ بن سلام وغیرہ من مؤمنی اهل الکتاب قیل کما اٰمن المهاجرون والانصار (معالم ص۲۹ ج ۱) انها للعهد ای کما اٰمن رسول اللّٰہ و
من معه وهم ناس معهودون او عبداللّٰہ بن سلام واشیاعه (کبیر ص۲۸۹ ج ۱، مدارك ص۱۷ ج ۱) ۲۴ یہ منافقین کا قول ہے اور لفظ سفہاء سے انہوں نے صحابہ کرام پر طنز کیا ہے
یعنی ہم (خاکش بدہن) ان بیوقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں جو اپنے نفع ونقصان کو بھی نہیں سوچتے ۔ وانما سفهوهم جهلا منهم حیث اشتغلوا بما لا یجدی فی زعمهم (روح ص۱۵۵ ج ۱)
امام رازی رح فرماتے ہیں کہ منافقین ۔ صاحب اقتدار لوگ تھے وہ دولت واقتدار کے نشہ میں مخمور طبقہ دین اسلام کو باطل سمجھتا تھا اور جو شخص باطل دین کو قبول کرے وہ بیوقوف ہوتا ہے
(کبیر ص۲۸۹ ج ۱) جیسا کہ آج کل روشن خیالی کے مرض میں مبتلا اور نشۂ اقتدار میں بدمست طبقہ دین کا درد رکھنے والوں اور ان کی خدا اور رسول ﷺ کے احکام سے بغاوت پر حرف گیری کرنے

والوں کو کم فہم، دقیانوسی اور موجودہ دور کے تقاضوں سے بے خبر وغیرہ القاب سے سرفراز فرماتے ہیں۔ یہ بعینہٖ ان منافقین کی تقلید ہے۔ ۲۵ یہاں بھی اسی زور اور تاکید کے ساتھ منافقین کا ردّ کیا گیا ہے۔ یعنی اصل میں بے وقوف تو وہ خود ہیں جو تمام انبیاء علیہم السلام کے متفقہ دین کو قبول کرنیوالوں پر سفاہت اور کم عقلی کا الزام لگا رہے ہیں۔ الا انھم ھم السفھاء دون المؤمنین المصدقین باللہ وبرسولہ وثوابہ وعقابہ (ابن جریر ص ۹۹ ج ۱) ۲۶ ان کی جہالت اور نادانی کا یہ عالم کہ وہ اپنی اس کھلی ہوئی حماقت اور سفاہت کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔

فائدہ ان آیتوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے یہ آیتیں ان کے مومنین مخلصین ہونے کا بیّن اور لافانی ثبوت ہیں ان کا ایمان اس قدر کامل، شوائب نفاق سے اس قدر پاک، خدا کے نزدیک اسقدر پسندیدہ اور مقبول ہے کہ اسے منافقین کے سامنے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ نیز اس مبارک جماعت کو بیوقوف کہنے والوں کو پرلے درجے کے بیوقوف قرار دیا ہے ۲۷ یہ منافقوں کی

لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾
فساد نہ ڈالو ملک میں ۲۲ تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ۲۳
اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾
جان لو وہی ہیں خرابی کرنے والے ۲۴ لیکن نہیں سمجھتے ۲۳
وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا
اور جب کہا جاتا ہے ان کو ایمان لاؤ جس طرح ایمان لائے سب لوگ (یعنی ۲۴ صحابہ) تو کہتے ہیں
اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ
کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بے وقوف ۲۵ جان لو وہی ہیں
السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ اِذَا لَقُوا
بے وقوف ۲۶ لیکن نہیں جانتے ۲۷ اور جب ملاقات کرتے ہیں
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى
مسلمانوں سے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں ۲۸ اور جب تنہا ہوتے ہیں اپنے شیطانوں (یعنی
شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ
سرداران یہود و مشرکین) ۲۹ کے پاس (جاکر) تو کہتے ہیں بیشک ہم تمہارے ۲۹ ساتھ ہیں ہم تو
مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ یَمُدُّهُمْ
ہنسی کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں سے) ۳۰ اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے ۳۱ اور ترقی دیتا ہے
فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا
ان کو ان کی سرکشی میں (اور) حالت یہ ہے کہ وہ ۳۲ (شک و تردد میں) حیران پھر رہے ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے مول لی
الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا
گمراہی (نفاق) ہدایت کے بدلے ۳۳ سو نافع نہ ہوئی ان کی سوداگری اور نہ
كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ﴿۱۶﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ
ہوئے وہ راہ پانے والے ۳۴ ان کی مثال ۳۵ اس شخص کی سی ہے جس نے

تیسری خباثت ہے کہ جب وہ بااثر اور مخلص مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم خالص ایمان لا چکے ہیں آمنّا سے منافقین مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلانا چاہتے تھے کہ اب انہوں نے نفاق چھوڑ دیا ہے اور دل سے خالص ایمان قبول کرلیا ہے کیونکہ ان کا زبانی ایمان تو مسلمانوں کو پہلے بھی معلوم تھا۔ فالمراد اخلصنا بالقلب الدلیل علیہ ان الاقرار باللسان کان معلوما منھم (کبیر ص ۲۹۹ ج ۱) مگر یہی لفظ ان کے نفاق کی غمازی کرتا ہے کیونکہ مسلمانوں کو پہلے سے اس نفاق کا علم تھا اب اس کی تردید کیلئے اور ان کے دلوں میں اپنے اخلاص کا سکہ بٹھانے کے لئے انہیں کوئی تاکیدی جملہ استعمال کرنا چاہئے تھا مگر اس کے باوجود وہ سرسری طور پر صرف اٰمنّا کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس لئے کہ نفاق قلبی کی وجہ سے وہ تاکیدی جملے کو گوارا نہیں کرسکتے۔ ۲۸ خلا کا صلہ عام طور پر باء آتا ہے مگر یہاں الٰی آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں خلا ذھب کے معنوں کو متضمن ہے اور مطلب یہ ہے کہ منافقین مسلمانوں سے ملنے کے بعد جب اپنے لیڈروں کے پاس جاتے ہیں تو وہاں مسلمانوں کے سامنے کئے ہوئے اقرار کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ اس تضمین کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے منافقین کی منافقت خوب عیاں ہو جاتی ہے۔ لہٰذا الٰی ذاھبین محذوف سے متعلق ہے جو خَلَوْا کے فاعل سے حال ہے۔ ای خلوا ذاھبین الی شیاطینہم۔ اور شیاطین سے علمائے یہود، اور شرک و کفر کے لیڈر مراد ہیں۔ شیاطینھم سادتھم وکبراؤھم ورؤساءھم من احبار الیھود ورؤس المشرکین والمنافقین (ابن کثیر ص ۵۱ ج ۱) ۲۹ یعنی دین اور ایمان اور عقیدہ میں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اِنّاہ صاحبو وموافقوکم علی دینکم (مدارک ص ۱۸ ج ۱) ۳۰ یعنی ہم دل سے تھوڑے مسلمان ہیں۔ دل سے تو تمہارے ساتھ ہیں مسلمانوں کے سامنے ایمان کا اظہار محض استہزاء اور تمسخر کے طور پر اور انہیں بیوقوف بنانے کے لئے کرتے ہیں۔ تاکہ وہ ہمیں مسلمان سمجھیں اور ہم سے مسلمانوں کا سا معاملہ کریں۔ ہمارا مال و جان محفوظ ہو جائے اور ہمیں مال غنیمت وغیرہ میں سے حصہ مل جایا کرے۔ انما نستخف بھم فی ذلک القول لصون دمائنا واموالنا وذراریتنا (نہر ص ۶ ج ۱) ۳۱ بعض اوقات ''جرم'' کی سزا پر لفظ ''جرم'' کا اطلاق کردیا جاتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں

ؔ یہ لوگ چونکہ نفاق مفادات کیوجہ سے توحید کو مانتے تھے اور مشرکین سے زیادہ مضر تھے اس لئے ان کے حالات زیادہ بیان کئے گئے ۱۲

ؔ مثال فریق ثانی یعنی مشرکین ۱۲

اس تمسخر اور استہزاء کی سزا دیگا۔ ان ینتقم منھم ویعاقبھم ویسخر بہم ویجازیھم علی استہزائہم فسمی العقوبۃ باسم الذنب (قرطبی ص ۲۰۷ ج ۱) اور بعض نے کہا کہ جس طرح منافقین مسلمانوں کو بنا رہے ہیں اسی طرح اللہ بھی منافقوں کو بنا رہا ہے اور ان سے تمسخر کا سا معاملہ کر رہا ہے مثلاً دنیا میں ان پر اسلام کے احکام جاری کرا رکھے ہیں اور انہیں مہلت دے رکھی ہے جب وہ کفر و سرکشی کی انتہا کو پہنچ جائینگے تو اچانک دھر لئے جائینگے منافقین ان چیزوں کو اپنے حق میں مفید سمجھ رہے ہیں مگر حقیقت میں یہ چیزیں ان کی تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ہیں۔ الاٰیۃ جاریۃ علی سبیل التمثیل والمراد یعاملھم سبحانہ معاملۃ المستھزئ اما فی الدنیا باجراء احکام الاسلام واستدراجھم من حیث لا یعلمون روح ص ۱۵۸ ج ۱) ۳۲ دوسری تفسیر کے مطابق یہ اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ کا بیان ہے۔ معطوف علی قولہ سبحانہ وتعالیٰ یستھزئ بھم کالبیان لہ علی رای (روح ص ۱۵۹ ج ۱) فِیْ طُغْیَانِهِمْ، یَمُدُّھُمْ سے متعلق ہے اور یَعْمَهُوْنَ ضمیر مفعول سے حال ہے یعنی وہ انہیں سرکشی اور گمراہی میں بڑھا رہا ہے اور وہ بے اطمینانی اور شک و تردد میں حیران و سرگرداں پھر رہے ہیں۔ ۳۳ اُولٰٓئِكَ سے مذکورہ منافقین کی طرف اشارہ ہے جن کی خباثتوں کا ابھی ابھی ذکر ہوا ہے۔ ان کی تمام خباثتوں کا سرچشمہ اختیاری گمراہی ہے

انہوں نے راہ ہدایت کو چھوڑ کر راہ ضلالت پر چلنے کی ٹھان لی ہے۔ اشتراء کے معنیٰ خریدنے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ خریداری کیلئے ضروری ہے کہ قیمت خریدار کے پاس موجود ہو۔ یہاں ہدایت کو گمراہی کی قیمت قرار دیا گیا ہے جس کے عوض منافقوں نے گمراہی مول لی تو اس سے لازم آتا ہے کہ منافقین پہلے ہدایت پر تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ شروع ہی سے منافقانہ طور پر ایمان لائے تھے تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہاں اشتراء بمعنیٰ استبدال نہیں بلکہ محض ترجیح اور اختیار کے معنیٰ میں ہے ان الاشتراء ھھنا عن الاختیار فکانہ تعالیٰ قال اختاروا الضلالۃ علی الھدیٰ (روح ص۱۶۱ ج ۱) یعنی انہوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی اور ہدایت کی بجائے گمراہی کو اختیار کیا۔ لیکن اس صورت میں باء ہدیٰ کی باء بمعنیٰ علیٰ ہوگی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اشتراء اپنے حقیقی معنوں ہی میں ہے اور ہدایت سے مراد وہ فطری ہدایت ہے جو اللہ نے انسان کی فطرت میں رکھی ہے۔ المراد بالھدیٰ الجبلی وقد کان حاصلا لھم حقیقۃً فان کل مولود یولد علی الفطرۃ (روح ص۱۶۱ ج ۱) اس صورت میں تمام الفاظ اپنی حقیقت پر رہتے ہیں اور کسی قسم کے

نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ
آگ جلائی (یعنی پیغمبرؐ) ۳۲ پھر جب روشن کردیا آگ نے آس پاس کو اور وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے) تو زائل کردی

وَتَرَكَهُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ لَّا یُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ
اللہ نے ان کی روشنی یعنی چھوڑ ان کو اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے ۳۸ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں

فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ اَوْ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْهِ
سو وہ نہیں لوٹیں گے ۳۹ فلہ یا ان کی مثال ایسی ہے ۴۰ جیسے زور سے مینہ برس رہا ہو آسمان

ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ
اس میں اندھیرے ہیں اور گرج اور بجلی دیتے ہیں انگلیاں اپنے کانوں میں

مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِیْطٌۢ
مارے کڑک کے موت کے ڈر سے ۴۱ اور اللہ احاطہ کرنے والا ہے

بِالْكٰفِرِیْنَ یَكَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ
کافروں کا ۴۳ قریب ہے کہ بجلی خیرہ کردے ان کی آنکھیں

كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ
جب چمکنے لگتی ہے ان پر تو چلنے لگتے ہیں اس کی روشنی میں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے

قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ
رہ جاتے ہیں ۴۴ اور اگر چاہے اللہ تو لے جائے ان کے کان اور آنکھیں ۴۵

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۰﴾ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ
بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۴۶ ف ۱ ف ۲ اے لوگو بندگی

اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ
کرو اپنے رب کی ۴۷ جس نے (ہی) پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے

قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ
پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ جس (ہی) نے بنایا واسطے تمہارے

ع ۲

مجاز کا ارتکاب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ۳۴ مگر یہ سودا ان کیلئے نفع بخش ثابت نہ ہوا۔ اور ہوتا بھی کیسے انہوں نے یہ سودا ہی بے عقلی اور بے بصیرتی سے کیا ہے۔ اور ایک ایسی چیز خریدلی ہے جس میں سراسر نقصان ہی نقصان ہے۔ ۳۵ عام مفسرین کی رائے کے مطابق اب یہاں سے منافقین کی دو مثالیں بیان کی جارہی ہیں پہلی مثال مَثَلُهُمْ سے لے کر لَا یَرْجِعُوْنَ تک اور دوسری اَوْ كَصَیِّبٍ سے لیکر آخر رکوع تک۔

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ہٰذا)

۳۶ آگے چل کر ان آگ جلانے والوں کے لئے جمع کی ضمیر ذکر کی گئی ہے اس لئے یہاں اَلَّذِیْ معنےً جمع ہے۔ اِسْتَوْقَدَ اور حَوْلَهٗ میں لفظ کے لحاظ سے ضمیر واحد استعمال کی گئی ہے اور جمع کی ضمیروں میں معنیٰ کا لحاظ کیا گیا ہے۔ ۳۷ یہ ماقبل کی تفسیر ہے یعنی جب آگ کی وجہ سے چاروں طرف روشنی ہوگئی تو اچانک آگ بجھ گئی اور وہ روشنی ان سے سلب کرلی گئی اور وہ گھٹاٹوپ اندھیروں میں چھوڑ دیئے گئے اور انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ اس تمثیل میں منافقین کے زبانی اقرار ایمان کو آگ جلانے سے تعبیر کیا گیا ہے اور اظہار اسلام کے بعد بطور مسلمان جو فوائد انہیں حاصل ہوئے اسے ماحول کی روشنی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور روشنی سلب کرلینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے ان کا نفاق نبی علیہ السلام پر ظاہر کرکے انہیں ان فوائد سے محروم کردیا اور انہیں پھر سے کفر وضلالت کی تاریکیوں میں چھوڑ دیا (کبیر ص۲۹۴ ج ۱) ۳۸ اگرچہ ان کے ظاہری حواس درست ہیں لیکن جب انہوں نے ان حواس سے کام نہ لیا، کانوں سے حق نہ سنا۔ زبان سے حق کا اقرار نہ کیا، اور بصیرت کی آنکھوں سے حق کو نہ دیکھا تو گویا ان کے حواس ہی بیکار ہوچکے ہیں۔ اور وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔ کانت حواسھم سلیمۃ ولکن لما سدوا عن الاصاخۃ الی الحق مسامعھم وابوا ان ینطقوا بہ السنتھم وان ینظروا ویتبصروا بعیونھم جعلوا کانما ایفت مشاعرھم (مدارک ص۲۰ ج ۱) ۳۹ یعنی اب ان کے ہدایت آنے کی [illegible] رہیں۔ لیکن حضرت شیخ علیہ الرحمۃ والغفران نے فرمایا کہ دنیا میں جب بھی کسی داعی توحید نے دعوتِ توحید پیش کی ہمیشہ لوگ دو جماعتوں میں بٹ گئے۔ کچھ لوگوں نے دعوتِ توحید کو مان لیا اور مومنین کہلائے اور کچھ لوگوں نے اس دعوت کو نہ مانا وہ کفار کے نام سے موسوم ہوئے پھر اگر مومنین کو مادی اور دنیوی اقتدار بھی حاصل ہوگیا تو کافروں میں خوشامدی لوگوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی۔ یہ لوگ ایک طرف مسلمانوں کے اقتدار سے مرعوب خائف ہوتے اس لئے ان کے سامنے اسلام کا اظہار کرتے اور اپنے کو اسلام اور مسلمانوں کے خیرخواہ ظاہر کرتے اور دوسری طرف کافروں سے ملے رہتے۔ یہ منافقین کی جماعت ہے۔ کافر بھی اسلام اور مسلمانوں کیلئے خطرہ ہوتے ہیں لیکن منافقین کافروں سے بھی زیادہ مضر اور خطرناک ہوتے ہیں۔ کیونکہ منافقین مسلمانوں میں ملے جلے رہتے ہیں اور مسلمان ان کو اپنی جماعت کے آدمی سمجھتے ہیں اس طرح منافقوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خفیہ ریشہ دوانیاں کرنے کا خوب موقع مل جاتا ہے اور وہ اپنے بن کر اس قدر نقصان پہنچاتے ہیں کہ اتنا دشمن اور بیگانے بھی نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں جماعتوں یعنی مومنین، کفار اور منافقین کا حال بیان کرنے کے بعد آخر الذکر دو جماعتوں کا حال خوب واضح کرنے کے لئے دو مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک علانیہ کافروں کیلئے یعنی مَثَلُهُمْ سے لَا یَرْجِعُوْنَ تک اور ایک منافقوں کیلئے یعنی اَوْ كَصَیِّبٍ سے آخر رکوع تک اس لئے مثلھم کی ھُمْ مطلق کفار کی طرف راجع ہے۔ پہلی مثال کافروں کیلئے اور اس کی تفصیل حسب ذیل ہے اَلَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہوں گے جنہوں نے آیاتِ بینات کے ذریعے

۱ مثال فریق ثالث یعنی منافقین ۱۲
۲ فیہ اندماج ای فی ذلک الموقف رجال قاعدون او لفظۃ ذوی محذوفۃ قبل صیّب ۱۲
۳ کنایۃ عن یعذبھم ۱۲

فتح الرحمٰن ف۱ مترجم گوید حاصل مثل آنست کہ اعمال منافقاں ہمہ حبط شود چنانچہ روشنی آں جماعۃ دور رشد ۱۲۔ ف۲ مترجم گوید حاصل مثل آنست کہ منافقان در ظلمات نفسانیہ افتادند و چون مواعظ بلیغہ شنوند فی الجملۃ انشراحے پیدا میشود و آں فائدہ نکند مانند مسافراں کہ در شب تاریک و ابر حیران باشند و در برق دو سہ قدم بروند و باز ایستند واللہ اعلم ۱۲۔

رشد وہدایت کی آگ جلائی فَلَمَّآ اَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَهٗ کے بعد یہ عبارت محذوف ہے وعندہ رجال آخرون یعنی اس آگ جلانے والے کے پاس کچھ اور لوگ بھی موجود تھے مگر یہ لوگ اس آگ کی روشنی سے محروم رہے کیونکہ
آگ کے لئے روشنی کے ساتھ ساتھ بینائی کا ہونا بھی ضروری ہے ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوۡرِهِمۡ اللہ نے ان سے نور بصیرت ہی چھین لیا۔ یہ کفار مکہ تھے جو آگ جلانے والے کے پاس موجود تھے جب قرب وجوار کے لوگ اس نور ہدایت سے مستفید ہو رہے
تھے اس وقت کفار مکہ ضد وعناد اور بغض وحسد کی وجہ سے کفر وعصیان اور جحود وانکار پر کمربستہ ہو گئے تو اس کا لازمی وتکوینی نتیجہ یہ ہوا کہ ان سے وہ نور بصیرت جو فطرۃً ہر انسان کو ملتا ہے چھین لیا گیا۔ اور ان کے دلوں سے احساس حق کی صلاحیت
سلب کر لی گئی۔ وَتَرَكَهُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ ان کے دلوں اور کانوں پر مُہرِ جباریت ثبت کر دی گئی اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے گئے اور انہیں گھپ اندھیرے میں چھوڑ دیا گیا کہ اب وہ کبھی راستہ نہیں دیکھ سکیں گے۔ صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ
فَهُمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ۔ اس آیت کا مفہوم بعینہٖ وہی ہے جو خَتَمَ اللّٰهُ الخ کا ہے۔ بہرے اور اندھے اس لئے کہ ان کے کانوں پر مُہر اور ان کی آنکھوں پر پردے ہیں۔ گونگے اس لئے ہیں کہ ان کے دلوں پر مُہر لگا دی گئی ہے۔ جب ان میں حق سمجھنے کی صلاحیت

الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنۡزَلَ
زمین بچھونا اور آسمان عمارت اور اتارا
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ
آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے میوے
رِزۡقًا لَّكُمۡ ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّ
کھانا تمہارا سو نہ ٹھہراؤ[۵۲] اللہ کے برابر کوئی اور
اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿٢٢﴾ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا
تم جانتے ہو[۵۳] اور اگر ہو تم[۵۴] شک میں اس کلام
نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ۖ
سے جو اتارا ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ ایک سورت اس قسم کی[۵۵]
وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ
اور بلاؤ جن کو حاضر کرتے ہو اللہ کے سوا[۵۶] اگر تم
صٰدِقِيۡنَ ﴿٢٣﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا
سچے ہو[۵۷] پھر اگر نہ کر و[۵۸] اور البتہ نہ کرو گے
فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖ
تم بچو آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں[۵۹]
اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿٢٤﴾ وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ
تیار ہے منکروں کے واسطے[۶۰] اور خوشی سنا ان کو جو یقین لائے اور
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ
کام نیک کئے[۶۱] کہ ان کو ہیں باغ بہتی نیچے
تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوۡا مِنۡهَا مِنۡ ثَمَرَةٍ
ان کے نہریں[۶۲] جس بار ملے ان کو وہاں کا کوئی[۶۳] میوہ

ہی نہیں تو حق گوئی کا وجود بھی نہیں ہوگا۔ جب کچھ سمجھیں گے ہی نہیں تو بولیں گے کیا؟ اور لَا يَرۡجِعُوۡنَ کا یہاں وہی مفہوم ہے جو وہاں لَا يُؤۡمِنُوۡنَ کا ہے۔ ایک بات ذہن نشین رہے کہ یہاں کفار کی ذوات کو ذات مستوقد سے تشبیہ نہیں دی گئی بلکہ ان کے قصے کو قصہ مستوقد سے تشبیہ دی گئی ہے۔ وانما شبهت قصتهم بقصة المستوقد (کبیر ص۲۹۵ ج۱) ۴۰ اَوۡ كَصَيِّبٍ پہلی تفسیر کے مطابق یہ منافقین کی دوسری مثال ہے اور اَوۡ تخییر کے لئے ہے اور حضرت شیخ کی تفسیر کے مطابق اَوۡ تنویع کیلئے ہے اور یہ منافقین کے حال کی واحد تمثیل ہے اور پھر اس تمثیل کی دو شقیں ہیں ایک وَاللّٰهُ مُحِيۡطٌۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ تک اور دوسری يَكَادُ الۡبَرۡقُ سے آخر رکوع تک۔ اور صَيِّبٍ سے پہلے لفظ ذوی یا

یہ اجواب شبہ اولیٰ
مریقولون افترٰہ

اصحاب محذوف ہے ای کاصحاب صیب (معالم ص۳۱ ج۱) یعنی منافقوں کی مثال ان لوگوں جیسی ہے جو شدید بارش میں گھر جائیں اور صیب کے معنی موسلا دھار بارش کے ہیں۔ ۴۱ سما ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اوپر کی جانب ہو السماء کل ما علاك فاظلك (قرطبی ص۲۱۶ ج۱) اور یہاں سما سے مراد بادل ہیں۔ ای من السحاب (معالم ص۳۱ ج۱) ۴۲ يَجۡعَلُوۡنَ الخ ظلمات اور رعد سے متعلق ہے۔ اور حَذَرَ الۡمَوۡتِ يَجۡعَلُوۡنَ کا مفعول لہ ہے جو اس فعل کی علت بیان کر رہا ہے۔ یعنی اس ڈر سے کہ کہیں صواعق کی گرجدار آواز سے وہ ہلاک نہ ہو جائیں وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں تاکہ وہ صواعق کی آواز سن ہی نہ سکیں۔ اس تمثیل میں صیب سے مراد ایمان یا قرآن ہے۔ ظلمات اور رعد سے وہ شدائد اور تکالیف مراد ہیں جو ایمان لانے کے بعد برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ یا اس سے قرآنی وعیدیں اور تخویفیں مراد ہیں اور برق سے ایمان کے دنیوی فوائد یا قرآن میں رشد وہدایت کا ذکر مراد ہے اور صواعق سے مراد شرعی تکالیف یا قرآن کی وعد ووعید کی آیات ہیں (کبیر ص۲۹۵ ج۱، معالم ص۳۲ ج۱، قرطبی ص۲۱۹ ج۱ وغیرہ) منافقین کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے تاکہ قرآن نہ سن سکیں کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ قرآن سننے سے کہیں ان کے دلوں میں ایمان نہ داخل ہو جائے اور ایمان قبول کرنے کو وہ موت کے مرادف سمجھتے تھے۔ جعلهم اصابعهم فی اٰذانهم لئلا یسمعوا القراٰن فیؤمنوا به وبمحمد علیه السلام وذلك عندهم کفر والکفر موت (قرطبی ص۲۱۸ ج۱) ۴۳ لیکن یہ حیلہ انہیں موت سے نہیں بچا سکتا کیونکہ جس کے اختیار میں
موت وحیات ہے وہ علم وقدرت کے لحاظ سے ان پر حاوی ہے وہ اس کی گرفت سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتے۔ اس مثال کا حاصل یہ ہے کہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہو۔ رعد کی گرجدار آواز بھی سنائی دے رہی ہو اور بجلی چمک رہی ہو تو اس وقت چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ رعد کی گرجدار آواز کی طرف دھیان دیتے اور سمجھتے کہ مزید بارش ہونے والی ہے اور اولے برسنے والے ہیں اس لئے اپنے بچاؤ کی کوئی صورت تلاش کرتے جب بجلی چمکتی اس وقت اپنے مأمن کا راستہ دیکھتے اور جب اندھیرا ہو جاتا اس وقت مأمن کی طرف چل پڑتے مگر ان منافقوں کا حال یہ ہے کہ وہ رعد کی آواز یعنی قرآنی وعیدیں سنتے ہی نہیں بلکہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے کہ کہیں ان کے دلوں میں ایمان نہ داخل ہو جائے کیونکہ ایمان کو تو وہ موت جانتے ہیں۔ ۴۴ یہ اس تمثیل کی دوسری شق ہے یعنی جب اندھیرے میں بجلی کوندتی ہے تو وہ اس کی روشنی میں چند قدم چل لیتے ہیں اور جونہی بجلی کی روشنی غائب ہوئی وہیں رک گئے یہی حال منافقین کا تھا کہ جب اسلام کی فتحمندی اور مسلمانوں کی کامیابی دیکھتے تو ان کے دل ایمان کی طرف مائل ہو جاتے لیکن جب ان پر کوئی مصیبت یا تکلیف آ پڑتی تو ایمان کی طرف سے بددل ہو جاتے کلما اصاب المنافقین من عز الاسلام اطمانوا الیه واذا اصاب الاسلام نکبة قاموا لیرجعوا الی الکفر (ابن کثیر ص۵۵ ج۱) حالانکہ چاہیئے تو یہ تھا۔

کہ روشنی میں راستہ دیکھتے اور اندھیرے میں راستہ ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے یعنی ہر حال میں صدقِ دل سے اور خلوصِ نیت سے اسلام کی پیروی کرتے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ خطفِ ابصار سے یہاں آنکھوں کا اچک لینا مراد نہیں بلکہ اس کے معنی خیرہ اور حیران کرنے کے ہیں یعنی قرآنی ہدایت کی روشنی جسے یہاں برق سے تعبیر کیا گیا روز بروز پھیل رہی تھی اور اسلام کی شان و شوکت اس تیزی سے بڑھ رہی تھی کہ منافقین کی آنکھیں اسے دیکھ کر خیرہ اور مرعوب ہو رہی تھیں مگر وہ تذبذب کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اور بعض موانع انہیں مخلصانہ ایمان سے روک رہے تھے۔ ۴۵ اس کا تعلق يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ اور يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ سے ہے علی سبیل اللف والنشر المرتب یعنی انہیں کان اس لئے دیئے کہ وہ ان سے حق بات سنیں مگر وہ حق سننے کی بجائے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں اور آنکھیں اس لئے دیں کہ وہ ان سے قرآنی ہدایت کی روشنی میں سیدھی راہ دیکھ کر منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں۔ مگر انہوں نے ان سے کبھی کام نہ لیا تو اگر اللہ چاہے تو رعد کی کڑک سے ان کی سماعت اور بجلی کی چمک سے ان کی بینائی سلب کرلے۔ ۴۶ اس کیلئے کوئی کام مشکل نہیں۔ ہر کام یکساں طور پر اس کی قدرت کے تحت داخل ہے۔

یہاں تک تمہید تھی جس میں ہدایت کے اصل سرچشمہ کی نشان دہی کی گئی اور ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے اوصاف اور ان کے انجام کا ذکر تھا۔ اب اگلی آیت سے دعوائے توحید پیش کیا جارہا ہے۔

دعوائے توحید

۴۷ تمہید میں تین جماعتوں یعنی مومنین، کفار اور منافقین کے اوصاف اور ان کی جزا و سزا بیان کرنے کے بعد اب یہاں ان سب کو مخاطب کرکے ان کے سامنے دعوتِ توحید بیان کی ہے۔ اس سورت میں دعویٰ توحید کو تین بار دہرایا گیا ہے جیسا کہ تفصیلاً پہلے گذر چکا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے یٰایُّہَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمْ (رکوع ۳) میں دعویٰ توحید کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ الخ (رکوع ۱۹) میں پہلی بار اس کا اعادہ فرمایا اور پھر اللّٰہُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ (رکوع ۳۴) میں دوبارہ اعادہ فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین تین قسم کا شرک کرتے ہیں (۱) شرک فی الدعاء یعنی پکارنے میں شرک (۲) نذر و نیاز میں شرک (۳) شفاعتِ قہری کے ذریعے یعنی اپنے معبودوں کو خدا کے یہاں شفیع غالب سمجھتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے تین جگہ دعویٰ توحید کو عقلی دلائل سے مدلل فرما کر بالترتیب شرک کی مذکورہ بالا تینوں قسموں کی نفی فرمائی ہے۔ عبادت کے معنی "غایت خضوع" اور "انتہائی عاجزی" کے ہیں۔ اس لفظ کا جامع مفہوم علامہ ابن قیم رح کی زبانی سنئے۔ العبادۃ عبارۃ عن الاعتقاد والشعور بان للمعبود سلطۃ غیبیۃ (ای فی العلم والتصرف) فوق الاسباب یقدر بھا علی النفع والضرر فکل دعاء وثناء و تعظیم ینشأ من ھذا الاعتقاد فھی عبادۃ (مدارج السالکین ص ج ۱) یعنی یہ اعتقاد اور شعور کہ ہمارے حالات جاننے اور ان میں باختیار خود تصرف کرنے میں ہمارے معبود کا مافوق الاسباب غیبی قبضہ ہے۔ اور اسی اعتقاد کے تحت اپنے معبود کو پکارا جائے، اس کی حمد و ثنا کی جائے، رکوع و سجود یا نذر و نیاز سے اس کی تعظیم بجا لائی جائے تو یہ سب کچھ عبادت ہے۔ تو یہ عبادت بجمیع اقسامہ وانواعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ یہاں عبادت سے "دعا" اور "پکار" مراد ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ الدعاء ھو العبادۃ (ابوداؤد ص ج ۱، ترمذی ص ج ۲) یعنی دعا ہی اصل عبادت ہے۔ اور دعویٰ توحید اعبدوا ربکم میں حصر اور تخصیص مراد ہے یعنی صرف اللہ ہی کی عبادت کرو، صرف اسی کو پکارو۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ ای افردوا الطاعۃ والعبادۃ لربکم دون سائر خلقہ (ابن جریر ص ج ۱) یعنی طاعت اور عبادت صرف اپنے رب ہی کی کرو اور اس کی مخلوق کو اس کی طاعت اور عبادت میں شریک نہ بناؤ۔ عبادت سے وہی دعا اور پکار مراد ہے۔ اور حصر کا دوسرا قرینہ وہ نتیجہ ہے جو دعویٰ توحید کے عقلی دلائل کے بعد مذکور ہے یعنی فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا ۔۔۔۔ الَّذِي اب یہاں سے دعویٰ مذکورہ پر عقلی دلائل کی ابتداء ہوتی ہے۔ الموصول صفۃ مادحۃ للرب وفیھا ایضا تعلیل للعبادۃ والربوبیۃ علی ما قیل (روح ص ج ۱) یہاں دعویٰ توحید پر جو عقلی دلیل پیش کی گئی ہے وہ پانچ امور پر مشتمل ہے۔ اوّل۔ خَلَقَكُمْ یعنی تمہیں پیدا کیا اور نعمتِ وجود سے سرفراز فرمایا۔ دوم وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ تمہارے آباء و اجداد، دوسرے تمام انسانوں، فرشتوں اور جنوں کا بھی وہی خالق ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ کیونکہ توحید کی پابندی ہی سے تقویٰ حاصل ہو سکتا ہے۔ لعل شک اور امید کیلئے موضوع ہے مگر جب اللہ کی طرف سے ہو تو یقین کے معنوں میں ہوتا ہے۔ قال سیبویہ لعل وعسٰی حرفا ترج وھما من اللہ واجب (معالم ص ج ۱) سوم الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا زمین کو تمہارے لئے اس نے فرش کی طرح ہموار بنا دیا ہے۔ تم اس پر چل پھر سکتے ہو۔ بیٹھ سکتے ہو اور اس پر اپنا کاروبار کر سکتے ہو۔ چہارم و پنجم وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ بارش کے ذریعے مردہ زمین کو زندہ کرکے اس سے تمہارے لئے روزی پیدا کی۔ ۴۸ یہ مذکورہ دلیل کا نتیجہ ہے۔ مخاطبین اپنا، اپنے آباؤ اجداد کا، باقی تمام انسانوں، جنوں اور فرشتوں کا، زمین و آسمان اور ساری کائنات کا خالق خدا ہی کو مانتے تھے۔ اور تمام تکوینی امور کو خدا ہی کے تصرف و اختیار میں سمجھتے تھے اس لئے ان مسلّمہ امور کو بطور دلیل پیش کرکے فرمایا کہ جب یہ سب کام اللہ ہی کے ہیں، جب یہ سارے انعامات اسی نے تم کو دیئے ہیں۔ جب تمہارا اور ساری کائنات کا خالق و مالک اور رازق وہی ہے اور ان تمام کاموں میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے تو پھر صرف اسی ہی کی عبادت کرو اور صرف اسی ہی کو اپنی حاجات و مشکلات میں غائبانہ پکارو اور اس کی عبادت اور پکار میں کسی نوری، ناری یا خاکی کو اس کا شریک مت بناؤ۔ جس نے یہ ساری نعمتیں۔ زندگی، یہ خوبصورت بدن، آنکھیں، کان، ناک، دل، دماغ وغیرہ زمین و آسمان، زمین کے بے بہا خزانے، چاند، سورج اور تارے وغیرہ وغیرہ۔ طلب اور درخواست کے بغیر تمہیں دیدیں۔ کیا وہ طلب اور درخواست پر تمہیں کچھ نہیں دیگا؟ پھر اس محسن و مربی کو چھوڑ کر اوروں کو کیوں پکارتے ہو! ۴۹ اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ان تمام امور کا فاعل اور رب کا خالق و رازق صرف اللہ ہے۔ اور تمہارے یہ معبود ان کاموں میں سے کوئی کام نہیں کر سکتے۔ وانتم تعلمون انھا لاتخلق شیئا ولا ترزق واللہ الخالق الرزاق (مدارک ص ج ۱) دعویٰ توحید کو عقلی دلائل سے واضح کرنے کے بعد توحید سے متعلق مشرکین کے دو شبہوں کا جواب دیا ہے۔ ایک شبہ تو یہ تھا کہ یہ دعویٰ خدا کی طرف سے نہیں ہے بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پاس سے باتیں بنا کر اور پھر انہیں خدا کی طرف منسوب کرکے ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ اللہ نے ان کے اس شبہ کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے۔ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ (یونس ع ۴)، دوسرا شبہ یہ تھا کہ یہ مسئلہ توحید خدا کی طرف سے نہیں ہے اور نہ ہی یہ کتاب خدا کا کلام ہے کیونکہ اس میں اولیاء اللہ کیلئے مکڑی جیسی گھٹیا چیزوں کی مثالیں بیان کی گئی ہیں جو اولیاء اللہ کے حق میں سخت توہین ہے۔ بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ اپنے نیک بندوں کی توہین کرے۔ ۵۰ یہ مشرکین کے پہلے شبہ کا جواب ہے یعنی جو کچھ ہم نے اپنے بندے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے اگر اس کے اللہ کی طرف سے ہونے میں تمہیں کسی قسم کا شبہ ہے تو اس کا واحد علاج حسب ذیل ہے ومعنی قولہ فی ریب منہ فی کونہ وحیا من اللہ تعالیٰ شانہ (روح ص ۱۹۲ ج ۱) ۵۱ کہ تم بھی زیادہ نہیں صرف ایک ہی سورت ایسی بنا لاؤ جو فصاحت و بلاغت میں، مضامین کی ندرت میں، واقعات ماضیہ اور آتیہ کی صداقت میں، امثال و مواعظ کی اثر انگیزی میں، دلائل و براہین کی جامعیت اور معقولیت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ قرآن کی مثل اور ہم پلہ ہو۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کا معجزہ ہونا صرف فصاحت و بلاغت ہی کے اعتبار سے نہیں ہے کیونکہ فَأْتُوا بِسُورَةٍ کا چیلنج تو تمام دنیا کے منکرین کو دیا گیا ہے خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی۔ اسلئے قرآن جس طرح فصاحت و بلاغت اور ترکیب الفاظ کے اعتبار سے معجز ہے اسی طرح مضامین و مطالب، واقعات ماضیہ و آتیہ اور دلائل و براہین وغیرہ کے لحاظ سے بھی معجز ہے۔ ۵۲ شہداء سے مراد

ان کے وہ معبود ہیں جن کی وہ پوجا کرتے تھے اور جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ ان کے حمائتی ہیں ، اور آڑے وقت میں کام آتے ہیں لہٰذا اب وقت ہے کہ وہ تمہارے کام آئیں ۔ المعنی ادعوا الذین اتخذتموھم
الٰھۃ من دون اللہ (کبیر ص۳۴۴ ج۱) استعینوا بالھتکم فی ذلک یمدونکم وینصرونکم (ابن کثیر ص۵۹ ج۱) ای واستعینوا بالھتکم التی تعبدونھا (معالم ص۳۴ ج۱) یا اس سے کفر و انکار میں ان کے ہم مسلک اور
ان کے یار و مددگار مراد ہیں ۔ المراد من الشھداء اکابرھم او من یوافقھم فی انکار امر محمد صلی اللہ علیہ وسلم (کبیر ص۳۴۴ ج۱) مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام اعوان و انصار کو بلا لو اور اپنے معبودوں
سے مدد کی درخواست بھی کر لو ، اور قرآن کا مثل بنا لاؤ ۔ ۵۳ یعنی اگر تم اپنے اس دعوی میں سچے ہو کہ یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ انسانی کلام ہے ، تم اس کا مثل بنا لاؤ کیونکہ تم بھی تو اہل لسان ہو اور تمہیں اپنی
فصاحت و بلاغت اور زبان آوری پر ناز ہے ۔ ۵۴ اس شرط کی جزا محذوف ہے ای فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فامنوا ۔ یعنی اگر تم قرآن کا مثل نہیں لا سکتے اور نہ ہی لا سکو گے تو تم مسئلہ توحید

رِزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ
کھانے کو تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ملا تھا ہم کو اس سے پہلے اور دیئے جائیں گے ان کو
مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ
پھل ایک صورت کے ۶۰ اور ان کے لیے وہاں عورتیں ہوں گی پاکیزہ ۶۱ اور وہ
فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا
وہیں ہمیشہ رہیں گے ۶۲ ف۲ بے شک اللہ شرماتا نہیں اس بات سے کہ بیان کرے کوئی مثال
مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ
ایک مچھر یا اس چیز کی جو اس سے بڑھ کر ہے سو جو لوگ مسئلہ توحید پر ایمان رکھتے ہیں وہ یقینا جانتے ہیں
اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ
کہ یہ مثال ٹھیک ہے جو نازل ہوئی ان کے رب کی طرف سے ۶۳ اور جو کافر ہیں سو کہتے ہیں
مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّیَهْدِیْ
کیا مطلب تھا اللہ کا اس مثال سے ۶۴ گمراہ کرتا ہے اس سے بہتیروں کو اور ہدایت کرتا
بِهٖ كَثِیْرًا ؕ وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِیْنَ
ہے اس سے ۶۵ بہتیروں کو اور گمراہ نہیں کرتا اس مثال سے مگر بدکاروں کو ۶۶ جو کہ توڑتے ہیں خدا کے
یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ ۪ وَیَقْطَعُوْنَ
معاہدہ (توحید) کو مضبوط کرنے کے بعد ۶۷ اور قطع کرتے ہیں
مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ
اس چیز کو جس کو اللہ نے فرمایا ملانے کو ۶۸ اور فساد کرتے ہیں ملک میں (شرک پھیلا کر) ۶۹
اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ
وہی ہیں ٹوٹے والے ۷۰ ف۳ کس طرح کافر ہوتے خدا نے تعالیٰ سے حالانکہ
كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ ۚ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ
تم بے جان تھے پھر جلایا تم کو پھر مارے گا تم کو پھر جلائے گا تم کو

	مان لو ۔ یہ قرآن مجید کا ایک اور معجزہ ہے کہ اس نے بلا خوف تردید اعلان کر دیا کہ قیامت تک قرآن مجید کا مثل کوئی پیش نہیں کر سکے گا ۔ چنانچہ آج تک قرآن کی ایک آیت کا مثل بھی پیش نہیں کیا جا سکا ، اور نہ ہی قیامت تک ایسا ممکن ہے (ابن کثیر ص۶۱ ج۱) ۵۵ یہ جزا محذوف یعنی فَاٰمِنُوْا کے قائم مقام ہے ۔ ۵۶ اگر تمام ذرائع اختیار کرنے کے باوجود بھی قرآن کا مثل پیش نہ کر سکو تو یقین کر لو
جواب شبہ ثانیہ واللہ تعالیٰ عنکبوت جیسی حقیر چیزوں کا ذکر کیوں کرتا ہے	کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے پیغمبر ہیں اگر اب بھی تم کفر و انکار پر اڑے رہے تو تمہارا ٹھکانہ جہنم کی وہ آگ ہوگی جس کا ایندھن خدا کے نافرمان بندے اور پتھر ہوں گے اور جو تم جیسے کافروں اور معاندوں ہی کیلئے تیار کی گئی ہے ۔ لہٰذا اس نار جہنم سے بچو اور کفر و انکار سے باز آ جاؤ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آؤ ۔ جہنم میں پتھر کا ایندھن اسلئے استعمال کیا جائیگا تاکہ آگ کی گرمی میں شدت پیدا ہو ۔ اور بعض مفسرین نے لکھا ہے
یضل متعلق ہے یقولون ماذا اراد اللہ پر اور یہدی متعلق ہے فیعلمون انہ الحق پر بطریق لف و نشر غیر مرتب ۱۲	کہ اس سے پتھر کی وہ مورتیاں مراد ہیں جنہیں سامنے رکھ کر مشرکین پوجا کرتے تھے ۔ وقیل المراد بھا حجارۃ الاصنام والانداد التی کانت تعبد من دون اللہ (ابن کثیر ص۶۲ ج۱) اس سے ایک طرف تو ان پتھر کی مورتیوں کی وجہ سے آگ میں شدت پیدا ہوگی اور دوسری طرف جب مشرکین اپنے معبودوں کی بے بسی اور بے کسی دیکھیں گے تو حسرت و افسوس کی وجہ سے ان کا عذاب دوگنا ہو جائے گا ۔ ایک جہنم کا عذاب اور دوسرا حسرت و ندامت اور تاسف و یاس کا ۔ یہ منکرین کیلئے ڈراوا تھا ۔ اب آگے مومنین کے لئے جنت کی خوشخبری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تخویف و تبشیر کو ساتھ ساتھ رکھا ہے ۔ ومن عادۃ اللہ انہ اذا ذکر اٰیۃ فی الوعید ان یعقبھا باٰیۃ فی الوعد
یہ متعلق بدلیل عقلی تام ہو بکل شیء علیم ۱۲	(کبیر ص۳۴۶ ج۱) ۵۷ جو لوگ مسئلہ توحید و رسالت پر ایمان لائے اور قرآن کو خدا کا کلام مانا اور اس کے مطابق عمل کیا انہیں خوشخبری سنا دیجئے ۔ ۵۸ یعنی انہیں آخرت میں ایسے باغات ملیں گے جن کے درختوں اور محلوں کے نیچے سے ندیاں بہتی ہوں گی ۔ ای من تحت اشجارھا ومساکنھا (معالم ص۳۴ ج۱) ۵۹ منھا اور من ثمرۃ میں من ابتدائیہ ہے ۔ اور رِزْقًا رُزِقُوْا کا مفعول ثانی ہے اور مفعول اول اس کا نائب فاعل ہے یعنی جب بھی انہیں جنت کے پھلوں سے کچھ کھانے کے لئے دیا جائیگا ۔ ۶۰ وہ اسے دیکھتے ہی

بول اٹھیں گے کہ یہ تو وہی مزیدار پھل ہے جو پہلے بھی ہم کھا چکے ہیں ۔ اس طرح وہ اپنی خوشی اور مسرت کا اظہار کریں گے ۔ ۶۱ جنت میں جو پھل جنتیوں کو دیا جائیگا وہ ظاہری شکل و صورت اور رنگ میں ملتا جلتا ہوگا مگر ذائقہ ہر ایک کا جداگانہ ہوگا ۔ قال ابن عباس ومجاھد والربیع متشابھا فی الالوان مختلفا فی الطعوم (معالم ص۳۴ ج۱) اور یہ چیز کوئی پھلوں ہی سے مخصوص نہیں ہوگی بلکہ جنت کے تمام کھانے ہی باہم ملتے جلتے ہوں گے ۔ قال الحسن یؤتی احدھم بالصحفۃ فیأکل منھا ثم یؤتی بالاخری فیقول ھذا الذی اُتینا بہ من قبل فیقول الملک کُل فاللون واحد والطعم مختلف (کبیر ص۳۴۷ ج۱ ، مدارک ص۲۸ ج۱) جنت میں اعلیٰ درجہ کی لذیذ مادی غذاؤں کے ساتھ سکون قلب کیلئے حسب منشا ذوق بھی ملیں گے ۔ ۶۲ یعنی وہ ہر قسم کی پلیدی اور ناشائستہ اخلاق اور ناپسندیدہ عادات سے پاک ہوں گی ۔ مطھرۃ من الغائط والبول والحیض والنفاس والبصاق والمخاط والمنی والولد

موضح القرآن ف۱ یعنی جنت کے ہر میوے کا مزہ جدا ہے اگرچہ صورت ملتی ہو ۔ صورت دیکھ کر جانیں گے کہ وہی قسم ہے جو کھا چکے ہیں اور چکھیں گے تو مزا جدا پائیں گے ۔ ف۲ قرآن شریف میں کہیں مثال فرمائی ہے مکڑی کی کہیں مکھی کی ۔ اس پر کافر عیب پکڑتے تھے کہ اللہ کی شان نہیں ان چیزوں کا ذکر کرنا یہ کلام اللہ کا ہوتا تو ایسے مذکور نہ ہوتے اس پر یہ دو آیتیں فرمائیں ۔

فتح الرحمٰن ف۱ کافراں چوں ذکر ذباب وعنکبوت در قرآن شنیدند طعن کردند وگفتند کہ خدا تعالیٰ ذکر ایں چیزہائے خسیس چرا ارادہ کردہ است ایں آیت نازل شد ۱۲

وکل قذر...... وقیل مطہرۃ عن مساوی الاخلاق (معالم ص۲۵ ج۱) ۶۳ یعنی نہ انہیں جنت سے نکالا جائیگا اور نہ ہی ان پر موت آئے گی۔ اور نہ ہی جنت کی نعمتیں فنا ہونگی
دائمون لایموتون فیہا ولا یخرجون (معالم ص۲۵ ج۱) فانہم مع ھذا النعیم فی مقام امین من الموت والانقطاع فلا اٰخر لہ ولا انقضاء بل فی نعیم سرمدی ابدی علی الدوام
(ابن کثیر ص۶۳ ج۱) ۶۴ مشرکین کے دوسرے شبہ کا جواب ہے۔ اور لایستحی کے معنی ہیں لا یترک کیونکہ جب انسانوں سے مختص اوصاف کو خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو ان اوصاف
سے ان کے نتائج مراد ہوتے ہیں اور حیا کا نتیجہ چونکہ ترکِ فعل ہے اس لئے یہاں یہی مراد ہے فاذا ورد الحیاء فی اللہ تعالیٰ فلیس المراد منہ ذلک الخوف الذی ھو مبدأ الحیاء ومقدمتہ بل
ترک الفعل الذی ھو منتہاہ وغایتہ (کبیر ص۳۵۴ ج۱) مثلاً کی تنوین تنکیر کے لئے ہے مَا نکرہ مثلاً کی صفت ہے جو اس میں مزید ابہام پیدا کرتا ہے۔ اور بعوضۃ اس سے بدل یا عطف بیان ہے

ثُمَّ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی
پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۶۳ وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے جو کچھ
الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ٭ ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ
زمین میں ہے سب پھر (اسی نے) قصد کیا آسمان کی طرف سو ٹھیک کر دیا
سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ هُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۹﴾ وَ اِذۡ
ان کو سات آسمان اور وہی ہر چیز سے خبردار ہے ۶۳ اور جب
قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ
کہا تیرے رب نے فرشتوں کو ۶۴ کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں
خَلِیۡفَۃً ؕ قَالُوۡۤا اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا
ایک نائب کہا فرشتوں نے کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں اس کو جو فساد کرے اس میں
وَ یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَ
اور خون بہائے ۶۵ اور ہم پڑھتے رہتے ہیں تیری خوبیاں اور
نُقَدِّسُ لَکَ ؕ قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ وَ
یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو ۶۶ فرمایا بیشک مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے ۶۷ اور
عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَی
سکھا دیئے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے ۶۸ پھر سامنے کیا ان سب چیزوں کو
الۡمَلٰٓئِکَۃِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنۡ کُنۡتُمۡ
فرشتوں کے پھر فرمایا بتاؤ مجھ کو نام ان کے ۶۹ اگر تم
صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا
سچے ہو ۷۰ بولے پاک ہے تو ہم کو معلوم نہیں مگر جتنا
عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ یٰۤاٰدَمُ
تو نے ہم کو سکھایا ۷۱ بیشک تو ہی ہے اصل جاننے والا حکمت والا ۷۲ فرمایا اے آدم

ع ۳/۹

۱ متعلق بدعوی توحید مع دلیل عقلی ۱۲

(کبیر ص۳۵۵ ج۱، روح ص۲۰۶ ج۱) فما فوقہا یہاں فوقیت سے مراد اسی معنی میں زیادتی اور فوقیت ہے جس میں تمثیل واقع ہوئی ہے یعنی حجم کی کمی اور حقارت۔ والمراد بالفوقیۃ الزیادۃ فی المعنی الذی وقع التمثیل فیہ وھو الصغر والحقارۃ فیہ وتنزل من الحقیر الی الاحقر (روح ص۲۰۶ ج۱) تو مطلب یہ ہوا کہ ان کے کہنے سے اللہ تعالیٰ مچھر یا اس سے بھی ادنیٰ اور حقیر چیز کی کوئی مثال بیان کرنے کو چھوڑنے سے رہا یعنی وہ حسبِ ضرورت اور مناسب محل ایسی مثالیں ضرور بیان کرتا رہیگا۔ مثال اس لئے بیان کی جاتی ہے تاکہ مسئلہ واضح ہو جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مکڑی کے جالے کی مثال دیکر یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی نبی یا ولی عبادت و پکار کے لائق نہیں یعنی غیر اللہ کا سہارا ایسا کمزور ہے جیسا مکڑی کا جالا۔ اگر یہ مثال بیان نہ کی جاتی تو غیر اللہ کی پکار کا مسئلہ اس طرح واضح نہ ہوتا۔ اب آگے ان مثالوں کے بیان سے مختلف لوگوں پر جو مختلف آثار مرتب ہوں گے ان کی تفصیل ہے۔ ۶۵ جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے اور قرآن کے کلام اللہ ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اور مسئلہ توحید مان چکے ہیں، انہیں تو اس بات کا یقین ہے کہ یہ مثال بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے اور موقع و محل کے مطابق ہے۔ ای یعلمون انہ کلام الرحمن وانہ من عند اللہ (ابن کثیر ص۶۴ ج۱) ۶۵ لیکن کفار معاندین حقارت آمیز لہجہ میں کہتے ہیں کہ آخر اس مثال سے خدا کی غرض کیا تھی؟ اس میں تو الٹا اللہ کی توہین ہے۔ ۶۶ منکرین کا خیال تھا کہ ان حقیر چیزوں کی تمثیلات سے کوئی فائدہ نہیں تو ان دو جملوں میں مثالیں بیان کرنے کی حکمت اور معتدبہ فائدہ بیان فرمایا کہ یہ مثالیں حق ہیں جو مسلمانوں کی ہدایت اور معاندین کی گمراہی میں اضافہ کا ذریعہ اور باعث بنتی ہیں۔ انہ مشتمل علی حکمۃ جلیلۃ وغایۃ جمیلۃ ھی کونہ وسیلۃ الی ھدایۃ المستعدین للھدایۃ واضلال المنہمکین فی الغوایۃ (روح ص۲۰۹ ج۱) وقال الشیخ رحمہ اللہ تعالیٰ فی ضرب الامثال بالمحقرات ابتلاء للمؤمنین والکفار۔ تمثیل بیان کرنا تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ تمثیل کا دستور قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ اور خود مشرکین اپنی روزمرہ

۲ ملائکہ پکارنے کے لائق نہیں کیونکہ وہ غیب دان نہیں ۱۲

کی گفتگو میں بھی مثالوں کا استعمال کرتے تھے۔ مشرکین کا یہ اعتراض کہ خداوند تعالیٰ مکھی اور مکڑی جیسی حقیر چیزوں کی مثالیں کیوں بیان کرتا ہے؟ یہ محض ضد اور عناد پر مبنی تھا۔ درحقیقت ان لوگوں کو چڑ تو مسئلہ توحید سے تھی اور یہ اعتراض تکذیب کا ایک بہانہ تھا۔ ہدایت دینے اور گمراہ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ان مثالوں کے ذریعہ ہدایت وضلالت کا حدوث ہوتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے ذریعے مومنین کو مزید انشراحِ صدر اور اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے اور گمراہوں اور مشرکوں کی الجھنوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے (روح ص۲۱۰ ج۱) ۶۷ فاسقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو حدود ایمان سے نکل جاتے ہیں۔ والمراد بالفاسقین ھنا الخارجون عن حد الایمان (روح ص۲۱۰ ج۱) یعنی ان کے ذریعے صرف ان لوگوں کو گمراہ کرتا ہے جو خود گمراہ رہنا چاہتے ہیں اور باختیار خود گمراہی اختیار کرتے ہیں۔ اضلال کو فاسقین سے مخصوص کرکے آگے ان کی کئی ایک خباثتیں بیان کی ہیں اس سے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ان سے گمراہی پر قائم رہنے اور ان سے توفیق ہدایت کے سلب ہو جانے کا اصل سبب ان کی یہی خباثتیں ہیں لہٰذا اس گمراہی کے اسباب خود ان کے اپنے پیدا کردہ ہیں اور ان اسباب میں اور ان کے آثار ونتائج میں وہی تکوینی تعلق ہے جو آگ میں اور جلانے میں جس طرح آگ کا کام ہے جلانا اور بھسم کرنا اسی طرح تمرد وسرکشی اور ضد وعناد کے توڑنے کا تکوینی نتیجہ ہے ہدایت سے ابدی محرومی اور یہاں اضلال کو اللہ کی طرف محض اسلئے منسوب کیا گیا ہے کہ وہ فاعل حقیقی اور خالق افعال ہے۔ واسناد الاضلال ای خلق الضلال الیہ سبحانہ بناء علی ان جمیع

الاشیاء مخلوقة له تعالیٰ (ابوالسعود ص۲۹ ج۱) **۶۸** یہ الفاسقین کی صفت کاشفہ ہے یعنی اللہ کے عہد توحید کو توڑتے ہیں اللہ کے وصل کو کاٹ کر غیر اللہ کو پکار رہے ہیں اور زمین میں شرک کے ذریعے فساد پھیلا رہے ہیں۔ عہد اللہ سے مراد توحید اور احکام الٰہی کا عہد ہے۔ قال الشیخ رحمہ اللہ تعالیٰ ما عھد اللہ الیھم ای من التوحید والاحکام۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں وعھدہ الی جمیعھم فی توحیدہ وما وضع لھم من الادلة علی ربوبیته وعھدہ الیھم فی امرہ ونھیه ما احتج به لرسله من المعجزات الخ (ابن کثیر ص۶۶ ج۱) یعنی اس عہد کی توثیق ہمیشہ آفاقی اور انفسی دلائل سے کتب منزلہ اور معجزات انبیاء علیہم السلام سے ہوتی رہی المراد ما وثق اللہ به عھدہ من الآیات والکتاب (بیضاوی) **۶۹** ان یوصل بہ کی ضمیر مجرور سے بدل الاشتمال ہے۔ ما اپنے عموم اور وسعت کے اعتبار سے ان تمام تعلقات کو شامل ہے جن کو قائم رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ المراد به الامر الشامل لما ذکر لما یوجب قطعه قطع الوسیلة بین اللہ تعالیٰ وبین العبد (روح ص۲۱۱ ج۱) یحتمل کل قطیعة لا یرضی بھا اللہ سبحانه وتعالیٰ (ابوالسعود ص۳۲ ج۱) الاشارة الی دین اللہ وعبادته فی الارض واقامة شرائعه وحفظ حدودہ فھی عامة فی کل ما امر اللہ به ان یوصل ھذا قول الجمھور (قرطبی ص۲۴۷ ج۱) **۷۰** شرک کرتے ہیں۔ لوگوں کو ایمان سے اور پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے روکتے اور کفر کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور ہر کام خواہشات نفسانیہ کے مطابق کرتے ہیں۔ خدا کی نافرمانیوں اور بداعمالیوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ای یعبدون غیر اللہ تعالیٰ ویجورون فی الافعال (قرطبی ص۲۴۷ ج۱) بالمعاصی وتعویق الناس عن الایمان بمحمد صلی اللہ علیه وسلم وبالقرآن (معالم ص۳۳ ج۱) افسادھم باستدعائھم الی الکفر والترغیب فیه وحمل الناس علیه (روح ص۲۱۲ ج۱) والاظھر منه الصد عن طاعة الرسول لان تمام الصلاح فی الارض بالطاعة (کبیر ص۳۶۶ ج۱) **۷۱** اولئك سے اشارہ فاسقین کی طرف ہے۔ ھم ضمیر فصل حصر کے لئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا صفات سے متصف فاسقین ہی نقصان اٹھانے والے ہیں اور حصر کمال نقصان کے اعتبار سے ہے کیونکہ دولت ایمان کی محرومی کی وجہ سے وہ دنیا اور آخرت دونوں جہان میں خسارے میں رہے **۷۲** مشرکین کے دونوں شبہات کا جواب دینے کے بعد یہاں سے پھر اصل دعویٰ توحید کی طرف رجوع ہے اور مزید دلائل سے اسے ثابت کیا گیا ہے۔ استفہام تعجب اور انکار کیلئے ہے اور تکفرون کے معنی تشرکون کے ہیں یعنی ایسے واضح دلائل کی موجودگی میں تم کس طرح اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہو۔ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ بعد نصب الدلائل ووضوح البرھان ثم ذکر الدلائل (معالم ص۳۴ ج۱) کیف تکفرون باللہ ای کیف تعبدون معه غیرہ (ابن کثیر ص۶۶ ج۱) دلائل واضحہ اور براہین قاطعہ کی موجودگی میں تمہارا شرک کرنا نہایت ہی قابل تعجب ہے۔ تم جانتے ہو کہ محیی و ممیت، خالق ارض وسما اور عالم کل شئ اللہ ہی ہے اور یہ اوصاف کسی میں نہیں پائے جاتے۔ تو پھر کیوں اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا یعنی تم بے جان نطفے تھے نطفًا فی اصلاب آبائکم (معالم) فَاَحْیَاکُمْ تمہیں زندگی دی اور زندگی کو قائم رکھنے کے لئے تمام ضروریات مہیا کیں۔ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ پھر جب تمہاری مقررہ عمریں پوری ہو جائیں گی وہ تمہیں مار دیگا۔ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ پھر قیامت کے دن وہ تم سب کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ پھر حساب وکتاب اور جزاء وسزا کے لئے تم اس کے سامنے لائے جاؤ گے۔ **۷۳** کائنات ارضی کو تمہارے لئے پیدا کیا تاکہ تم اس سے مادی فوائد حاصل کرو، اور اس میں غور وغوض کر کے خالق کی قدرت وصنعت کا اندازہ لگاؤ، زمین میں ہمارے صرف دنیوی فائدے ہی نہیں بلکہ اس میں دینی فائدے بھی ہیں اور سامان آخرت بھی۔ واما قوله لکم فھو یدل علی ان المذکور بعد قوله خلق لاجل انتفاعنا فی الدین والدنیا (کبیر ص۳۷۸ ج۱) ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ ۔ استوی کا صلہ جب اِلیٰ ہو تو اس کے معنی قصد کرنے اور متوجہ ہونے کے ہیں۔ استوی الی ای اقبل (قرطبی ص۲۵۵ ج۱) زمین پیدا کرنے کے بعد وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔ فَسَوّٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ تسویہ سے مراد یہ ہے کہ آسمانوں کو بالکل اور مکمل بنایا اور ان میں کسی قسم کی دراڑ یا شکن باقی نہ رہنے دی۔ ومعنی تسویتھن تعدیل خلقھن واخلاؤہ من العوج والفطور واتمام خلقھن (کبیر ص۳۸۳ ج۱) وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ جس طرح وہ تمام کائنات ارضی وسماوی کا خالق ہے اسی طرح وہ سارے عالم کے ذرہ ذرہ کو جانتا ہے اور زمین وآسمان کی کوئی چیز اس کے علم محیط سے باہر نہیں۔ اس آیت کی ابتدا یعنی ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ میں مبتدا اور خبر دونوں کے معرفہ ہونے کی وجہ سے حصر ہے پھر ثُمَّ اسْتَوٰۤی خَلَقَ پر معطوف ہے اور وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ پر معطوف ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب کلام کی ابتداء میں حصر ہو تو اس کے باقی اجزاء میں بھی حصر ہوگا۔ تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ ہی زمین وآسمان کا خالق وکارساز ہے اور صرف اللہ ہی ہر چیز کا عالم ہے۔

نتیجہ:۔ جب تم جانتے ہو کہ موت وحیات خدا کے قبضہ میں ہے، زمین وآسمان کا خالق بھی وہی ہے اور ہر ظاہر وچھپی ہوئی چیز کا جاننے والا بھی وہی ہے۔ جب یہ سب کام اسی کے ہیں اور ان میں کوئی اس کا شریک نہیں تو پھر عبادت اور پکار میں اوروں کو کیوں اس کا شریک بناتے ہو۔ نیز تمام دینی ودنیوی نعمتیں بھی اسی نے عطا کی ہیں اور بغیر مانگے دی ہیں تو پھر وہ کونسی چیزیں ہیں جو وہ نہیں دے سکتا اور تم وہ غیروں سے مانگتے ہو۔ کوئی انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کو پکار رہا ہے، کوئی ملائکہ مقربین سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہے اور کوئی جنوں کے یہاں پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔ حالانکہ کوئی ناری یا خاکی خدا کا شریک نہیں ہو سکتا کیونکہ معبود صرف وہی ہو سکتا ہے جو زمین وآسمان کا خالق ومالک اور ہر چیز کا عالم ہو مگر نوریوں، ناریوں اور خاکیوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے۔ **۷۴** اِذْ ظرف کا عامل یہاں محذوف ماننے کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے یہاں اُذْکُرْ محذوف مانا ہے۔ کیونکہ بعد میں آنے والا قَالُوْٓا اس میں عامل ہے۔ اور ظروف کے عوامل کا ان پر مقدم ہونا جائز ہے۔

خَلِیْفَةً ـــــ خلیفہ اسے کہتے ہیں جو کسی دوسرے کے بعد اس کی جگہ اس کے فرائض سنبھالے۔ الخلیفة من یخلف غیرہ ویقوم مقامه (کبیر ص۳۸۵ ج۱) **۷۵** فرشتوں کا سوال بطور اعتراض یا بنی آدم سے بوجہ حسد کے نہیں تھا بلکہ محض استفسار اور استکشاف کے طور پر تھا۔ لیس علی وجه الاعتراض علی اللہ ولا علی وجه الحسد لبنی آدم کما قد یتوھمه بعض المفسرین (ابن کثیر ص۶۹ ج۱) اور بنی آدم کے متعلق فساد برپا کرنے اور خون ریزی کرنے کا نظریہ انہوں نے ان کو جنوں پر قیاس کر کے قائم کیا تھا کیونکہ پہلے زمین پر جن آباد تھے اور ان کا فساد فی الارض خون خرابہ فرشتے دیکھ چکے تھے۔ تو انہوں نے خیال کیا کہ بنی آدم جنہیں اب خلیفہ بنایا جائیگا وہ بھی ایسے ہی ہونگے۔ **۷۶** قال الشیخ رحمہ اللہ تعالیٰ قول الملائکة نحن نسبح بحمدك یرجع الی نفی النقص فی ملکه تعالیٰ فی الحال وقولھم نقدس لك یرجع الی نفیه فی المستقبل فرشتوں کا یہ قول بھی فخر وغرور کی بنا پر نہیں تھا بلکہ محض نیازمندی کے اظہار کے طور پر تھا جس طرح ایک مخلص خادم اپنے آقا سے کہتا ہے کہ حضور یہ خدمت آپ جس کے سپرد کرنا چاہتے ہیں وہ اس کا صحیح حق ادا نہیں کر سکے گا۔ میں جو ہمیشہ سے آپ کا مخلص خادم ہوں اور ہر وقت خدمت میں کمربستہ رہتا ہوں یہ خدمت آپ میرے ہی سپرد کر دیں۔ بعینہٖ یہی طریقہ فرشتوں نے اختیار کیا تھا۔ لیس المقصود الاستفسار عن المرجح لا التعجب والتفاخر (روح ص۲۲۲ ج۱) علی طریقة من یجد فی خدمة مولاہ وھو یامر بھا غیرہ اتخدم العصاة وانا مجتھد فیھا (ابوالسعود ص۲۵۶ ج۱) **۷۷** فرشتوں کا علم محدود تھا۔ سابقہ تجربہ کی بنا پر وہ صرف یہ اندازہ تو لگا سکے کہ یہ نئی مخلوق فسادی اور خونریز ہوگی مگر اس مخلوق کی دوسری خوبیوں اور اسکے پیدا کرنے کی دیگر مصلحتوں سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کے پیدا کرنے میں جو مصالح پوشیدہ ہیں، انہیں تم نہیں جانتے ہو۔ ای اعلم من الحکم فی ذلك ما ھو خفی علیکم یعنی یکون فیھم الانبیاء والاولیاء والعلماء (مدارک ص۳۲ ج۱) ای اعلم من المصلحة الراجحة فی خلق ھذا الصنف علی المفاسد التی ذکرتموھا ما لا تعلمون انتم (ابن کثیر ص۶۹ ج۱) حاصل یہ ہے کہ ان میں فسادی اور خون ریز بھی ہوں گے لیکن ان میں جو خوبیاں ہوں گی وہ ان مفاسد پر راجح ہوں گی۔ وہ یہ کہ ان میں انبیاء اور رسل ہونگے، صدیقین اور شہداء ہوں گے، اولیاء اور علماء ہوں گے۔ انسان کی خلقت میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ انسان صفات خداوندی کا مظہر بنا۔ اگر انسان کو پیدا نہ کیا جاتا تو خداوند تعالیٰ کی صفات مثلاً رزاقیت، جباریت، وغفاریت وغیرہ کا ظہور نہ ہوتا۔ **۷۸** فرشتوں کے سوال کا اجمالی جواب تو اوپر گذر چکا اب ان کے مزید اطمینان کے لئے حضرت آدم علیہ السلام کی اس برتری کا عملاً اظہار کیا جا رہا ہے۔ یہاں کل استغراق حقیقی کے لئے نہیں بلکہ کل اضافی ہے اور اس سے مراد وہ ضروری اشیاء ہیں جو آدم علیہ السلام کے مناسب تھیں ہر چیز مراد نہیں کما فی قوله تعالیٰ یاخذ کل سفینة غصبا واوتیت من کل شئ، وفتحنا علیھم ابواب کل شئ اسماء سے اشیاء

کے خواص اوران کی تاثیرات مراد ہیں۔ المراد بالاسماء صفات الاشیاء ونعوتہا وخواصہا (روح صفحہ ج ۱) اور تعلیم سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی فطرت میں اس علم کی استعداد رکھدی تھی اور انہوں نے اس فطری استعداد کے ذریعے ان اشیاء کے خواص واوصاف بیان کردیئے۔ لہٰذا آدم ؑ کی یہ برتری ان کی فطرت اور جبلت کے اعتبار سے تھی۔ یہ مطلب نہیں کہ فطری استعداد کے علاوہ ان کو علم دیا گیا تھا کیونکہ اس طرح یہ اعتراض لازم آتا ہے کہ جب ان اشیاء کا علم حضرت آدم ؑ کو دیدیا تو اس میں ان کا کیا کمال ہے؟ اور فرشتوں کو نہیں دیا تو اس میں ان کا کیا قصور ہے۔ ۷۹ پھر وہ اشیاء فرشتوں کے سامنے پیش کرکے ان سے سوال کیا کہ وہ ان اشیاء کے خواص بتائیں۔ ۸۰ اگر تم اس دعوٰی میں سچے ہو کہ ہماری موجودگی میں جو ہر وقت اللہ کی تسبیح وتقدیس اور تحمید وتمجید میں مصروف رہتے ہیں کسی اور مخلوق کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں جس سے فساد اور خونریزی کا اندیشہ ہو۔ ۸۱ فرشتوں نے اپنے عجز اور قصور علم کا اعتراف کرلیا کہ اے اللہ! ہمیں تو صرف وہی چیزیں معلوم ہیں جن کا علم تو نے ہمیں ہماری استعداد کے مطابق عطا فرمایا ہے اور جو چیزیں ہماری قابلیت اور استعداد سے بالا ہیں ان کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ لا علم لنا الا ما علمتنا بحسب قابلیتنا من العلوم المناسبة لعالمنا ولا قدرة لنا علی ما هو خارج عن دائرة استعدادنا (ابوالسعود صفحہ ج ۱)

أَنۢبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ ۖ فَلَمَّآ أَنۢبَأَهُم بِأَسْمَآئِهِمْ
بتا دے فرشتوں کو ان چیزوں کے نام ۸۳ پھر جب بتا دیئے اس نے ان کے نام
قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّىٓ أَعْلَمُ غَيْبَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ
فرمایا کیا نہ کہا تھا میں نے تم سے کہ میں خوب جانتا ہوں چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی
وَٱلْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ
اور زمین کی اور جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو
تَكْتُمُونَ ﴿٣٣﴾ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ ٱسْجُدُوا۟
چھپاتے ہو ۸۴ اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو دزق
لِءَادَمَ فَسَجَدُوٓا۟ إِلَّآ إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَٱسْتَكْبَرَ وَ
آدم کو تو سب سجدے میں گر پڑے مگر شیطان اس نے نہ مانا اور تکبر کیا اور
كَانَ مِنَ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿٣٤﴾ وَقُلْنَا يَٰٓـَٔادَمُ ٱسْكُنْ أَنتَ
ہوگیا وہ کافروں میں کا ۸۵ اور ہم نے کہا اے آدم رہا کر تو
وَزَوْجُكَ ٱلْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ
اور تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں جو چاہو جہاں کہیں سے چاہو
وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ ٱلشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ
اور پاس مت جانا اس درخت کے پھر تم ہو جاؤ گے
ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٣٥﴾ فَأَزَلَّهُمَا ٱلشَّيْطَٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا
ظالم ۸۶ پھر ہلا دیا ان کو شیطان نے اس جگہ سے ۸۷ پھر نکالا ان کو
مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلْنَا ٱهْبِطُوا۟ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ
اس عزت وراحت سے جس میں تھے ۸۸ اور ہم نے کہا تم سب اترو تم ایک دوسرے کے
عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِى ٱلْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَٰعٌ إِلَىٰ
دشمن ہوگے ۸۹ اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ہے ایک

۸۲ تو ہی علیم وحکیم ہے۔ تیرا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، مختلف مخلوق میں مختلف استعدادیں رکھنے کی حکمت کو تو ہی اچھی طرح جانتا ہے۔ ۸۳ جب فرشتوں نے اپنے عجز اور قصور علم کا اعتراف کرلیا تو حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے وہی سوال ان پر پیش کیا گیا۔ ۸۴ میں تمہاری حقیقت کو اور تمہارے ظاہری اور باطنی حالات کو اچھی طرح جانتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ تمہاری حقیقت اور ہے اور انسان کی حقیقت اور ہے۔ یہاں تک فرشتوں کا عجز، قصور علم اور کمالات میں حضرت آدم علیہ السلام سے فروتر ہونا روز روشن کی طرح واضح ہوگیا۔ خود فرشتوں کے اپنے اقرار سے بھی اور اللہ تعالیٰ کے اعلان سے بھی جب اس نوری مخلوق کے عجز اور قصور علم کا یہ حال ہے اور وہ آدم ؑ سے بعض کمالات میں کم بھی ہیں تو پھر وہ خدا کے شریک کس طرح بن سکتے ہیں۔ لہٰذا انہیں متصرف ومختار اور عالم الغیب مت سمجھو اور انہیں غائبانہ مت پکارو۔ نیز فرشتے تو خود نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ کا اعلان کرکے خدا کی توحید کا اقرار اور شرک کی تردید کررہے ہیں اور تم انہی کو خدا کا شریک بنا رہے ہو۔ ۸۵ فرشتوں کو سجدہ کا حکم، ان کے عجز ونیاز کا اظہار اور حضرت آدم علیہ السلام کی ان پر برتری ثابت کرنے کے لئے دیا گیا۔ سجدہ سے مراد شرعی سجدہ ہے۔ یہ حکم اس خاص وقت میں نوریوں کو ہوا تھا کہ وہ آدم ؑ کو سجدہ کریں۔ یہ حکم فرشتوں ہی سے مخصوص تھا اب اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو سجدہ کرے یا لِاٰدَمَ کا لام بمعنی الی ہوگا تو اس صورت میں مسجود حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہوگا اور حضرت آدم علیہ السلام کی حیثیت قبلہ کی ہوگی جیسا کہ ہم شب وروز بیت اللہ کی طرف سجدہ کرتے رہتے ہیں (روح صفحہ ج ۱) سجدہ غیر اللہ کی پوری تحقیق سورۂ یوسف کی تفسیر میں آئیگی انشاء اللہ تعالیٰ لیکن اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ یہ سجدہ شرعی نہیں تھا بلکہ لغوی تھا اور اس سے مراد صرف عجز وانکسار کا اظہار تھا۔ وقیل المعنی اللغوی ولم یکن فیه وضع الجباه بل کان مجرد تذلل وانقیاد (روح صفحہ ج ۱) فَسَجَدُوٓا۟ إِلَّآ إِبْلِيسَ اللہ کے اس حکم کی تمام فرشتوں نے فوراً تعمیل کی لیکن ابلیس اکڑ گیا۔ أَبَىٰ وَٱسْتَكْبَرَ۔ اس نے کبر وغرور کی وجہ سے سجدہ کرنے سے انکار کردیا اور اپنے آپ کو حضرت آدم علیہ السلام سے برتر سمجھا۔ وَكَانَ مِنَ ٱلْكَٰفِرِينَ اور اللہ کے علم میں وہ ازلی بدبخت تھا اور اللہ کو معلوم تھا کہ وہ ایمان کے بعد کفر کریگا۔ اور یا کَانَ بمعنی صَارَ ہے یعنی انکار اور استکبار کی وجہ سے وہ کافر ہوگیا۔ یہاں فرشتوں کے پجاریوں پر ایک حقیقت واضح کردی کہ انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی تعظیم کیلئے ان کے سامنے جھکنے کا حکم ملا تھا۔ جو مخلوق تمہارے دادا کی تعظیم پر مامور کی گئی اب تم اس کے سامنے کیوں جھکتے ہو؟ اور اپنی خودی کو کیوں برباد کرتے ہو؟ جو لوگ جنات کو پوجتے ہیں وہ بھی غور کریں کہ جنات تو پہلے دن سے انسانوں کے دشمن ہیں اور ان کی دشمنی بالکل واضح ہے پھر ان کو وہ خدا کا شریک بناتے اور خدا کے سوا کارساز سمجھتے ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے أَفَتَتَّخِذُونَهُۥ وَذُرِّيَّتَهُۥٓ أَوْلِيَآءَ مِن دُونِى وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ (سورۂ کہف) ۸۶ زوجہ سے مراد مائی حوا ہیں جنہیں اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی دلجوئی اور تسکین خاطر کے لئے پیدا فرمایا۔

۱ ابلیس اور اس کی ذریت بھی پکارنے کے لائق نہیں کیونکہ وہ تمہارے پرانے دشمن ہیں۔ ۱۲

۲ آدم اور حوا علیہما السلام بھی پکارنے کے لائق نہیں۔ کیونکہ وہ غیب دان نہیں ۱۲